Understand *THE HOLY QURAAN* with the HELP of 2 COLOURS

ENGLISH & URDU

Translation and With *Transliteration*

QURAAN-E-ḤAKEEM

Translation Compiled by

Maulana Sayyed Shabbir Ahmad (RHA) (Urdu)

Sayyed Muhammed Aarif (English)

QURAAN ĀĀSAAN TEḤREEK (REG)

50-Lower Mall, Near M.A.O. College Lahore-Pakistan.

Ph :+92+42-7242265 - 7242266 -FAX :7324904

websites : www.quranasan.org & www.asanquran.com

E-mail : qat@lcci.org.pk , info@quranasan.org

کیا ہم مسلمان ہیں؟

هَلْ نَحْنُ مُسْلِمُوْنَ



تصنیف: شیخ محمد قطب

ترجمہ: مولانا سید شبیر احمد

قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ) لاہور

کیا ہم مسلمان ہیں؟

هَلْ نَحْنُ مُسْلِمُوْن

تصنیف: شیخ محمد قطبؒ

ترجمہ: مولانا سید شبیر احمدؒ

قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ)

50۔ لوئر مال نزد ایم۔ اے۔ او کالج لاہور

مصنف ---------------------- شیخ محمد قطبؒ
مترجم ---------------------- مولانا سید شبیر احمدؒ
طابع وناشر ---------------- قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ)
پریس ---------------------- قومی پریس لاہور
ایڈیشن اوّل ---------------- جولائی 2006ء
ہدیہ ---------------------- 60روپے

قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ)
50۔لوئر مال نزد ایم۔اے۔او کالج لاہور
فون:7242266-7242265-42-92+
فیکس:7324904-42-92+
Email: qat@lcci.org.pk,
info@quranasan.org
Website: www.quranasan.org
& www.asanquran.com

فہرست

مسلمان خواتین کا یورپی تہذیب اختیار کرنا۔

مشنت کردار ... نوجوانوں کو ... محسوس کرنا۔

۱۷۱ ، ۱۷۳ ، ۱۷۳

اسلامی عقیدہ میں مغالطہ پیدا کرنا۔

۲۰۵

اسلام کے بارے میں شبہات۔

اسلام سے نوخیز جوانوں کو دور کرنے والی تعلیمی پالیسیاں۔

اسلام سے بے بہرہ اور دین سے متنفر طبقہ دانشوراں۔

عرض ناشر

زیر نظر کتاب "کیا ہم مسلمان ہیں؟" فضیلۃ الشیخ الاستاذ محمد قطبؒ کی بہت ہی مقبول و معروف تصنیف هل نحن مسلمون؟ کا اُردو ترجمہ ہے۔

ہم جناب کرامت شیخ صاحب کے شکر گزار ہیں کہ موصوف نے مولانا سید شبیر احمدؒ کی ترجمہ شدہ کتاب قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ) کے فورم سے چھاپنے کی اجازت دے کر ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔

قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ) ایک مدت سے دو رنگوں میں قرآن حکیم کا ترجمہ مرتبہ مولانا سید شبیر احمدؒ اور دیگر کتب بالخصوص دنیائے عرب کے عالی مقام مُصنفین کی گراں قدر تصنیفات کے ترجمے شائع کرنے کا فریضہ ادا کر رہی ہے تاکہ اُردو دان طبقہ اسلام کے ان مُفکرین وعلماء کے افکار و نگارشات سے مستفید ہو سکے۔ اُردو زبان میں اسلامی لٹریچر کا گراں بہا ذخیرہ موجود ہے۔ علاوہ بریں متعدد ادارے اس سلسلے میں مفید اور قابل قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں جس کے نتیجے میں اسلامی علوم اور دینی موضوعات پر نئی نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ہونے والی ہمہ جہت کوششوں میں کسی حد تک اپنے حصّہ کا کردار ادا کر رہی ہیں تاہم موجودہ دور کے عرب مفکرین اور فضلاء نے اس مقصد کے لیے جو شاندار تحقیقی اور مجتہدانہ کارنامے انجام دیے ہیں، اپنی عظیم افادیت کے باوجود ابھی تک پوری طرح اُردو دان طبقہ کے سامنے نہیں آئے۔ انہی غیر معمولی کارناموں میں سے ایک شیخ محمد قطبؒ کی یہ بلند پایہ تصنیف ہے۔

ہم یہ بصیرت افروز کتاب اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہونے پر بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں اور پورے اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ مطالعہ کتاب کے بعد اس کی افادیت اور اہمیت کے بارے میں آپ ہمارے ساتھ مکمل اتفاق کرتے ہوئے مصنف، مترجم، ناشر اور سب معاونین کے لیے فلاح دارین کی دُعا فرمائیں گے۔

انتظامیہ

قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ)

50 لوئر مال نزد ایم۔ اے۔ او کالج لاہور

حرفے چند

کیا ہم مسلمان ہیں؟ فضیلۃ الشیخ محمد قطب کی بلند پایہ تصنیف "ھل نحن مسلمون؟" کا اردو قالب ہے۔ شیخ محمد قطب کا شمار دورِ حاضر اور دنیائے عرب و اسلام کی ان برگزیدہ ہستیوں میں ہے جو ہر قسم کے تعارف سے مستغنی اور تعریف و توصیف سے بے نیاز ہیں۔

مصنف کا نام کتاب کی قدر و قیمت کی ضمانت ہے اور اہمیت و افادیت کا اندازہ لگانے کے لیے بھی مصنف کی شخصیت کافی ہے۔ اس سلسلے میں کتاب پر کسی قسم کے تبصرہ کو غیر ضروری خیال کرتے ہوئے آپ کو مطالعہ کتاب کی دعوت دیتا ہوں اور محض ترجمہ کے متعلق چند الفاظ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ ویسے بھی ان صفحات کی تنگ دامانی مصنف کی فکر و نظر کی وسعتوں کو سمونے اور میرے قلم کی بے سر و سامانی کتاب کے محاسن کو سمیٹنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

یہ ترجمہ نہ تو ترجمانی ہے اور نہ آزاد یا لفظی ترجمہ بلکہ میری کوشش جو کہ ایک مشکل کام ہے یہ رہی ہے کہ فاضل مصنف نے جو کچھ عربی میں سوچا اور عرب ماحول اور عربی زبان کے طریقۂ ابلاغ اور انداز اظہار کے مطابق منتخب الفاظ و معانی استعمال کرتے ہوئے اپنے قاری کے سامنے پیش کیا ہے وہی سب کچھ حتی الوسع اپنے اصلی رنگ میں اردو زبان کے قریب ترین الفاظ و معانی کی مدد سے اردو میں کتاب پڑھنے والے تک پہنچ جائے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں نے کوشش کی ہے کہ جنابِ مصنف کے جذبات و عواطف، الفاظ و معانی اور انداز فکر و نگارش کو اس طرح اردو میں منتقل کیا جائے کہ جس حد تک ہماری ترقی پذیر زبان کی وسعت و بضاعت اجازت دے اور جس قدر مترجم کا مبلغ علم اور ذخیرۂ معلومات فاضل مصنف کے علم و فن اور انداز اظہار و بیان کا ساتھ دے سکے اصل چیز قاری کے سامنے آ جائے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا، تاہم کوئی دعویٰ نہیں، نہ علم و دانش کا اور نہ تجربہ و مہارت کا۔ محض ایک مخلصانہ کوشش ہے۔

انبیاء کرام کے سوا کوئی انسان اگر غلطی نہ کرے تو اس کا انسان ہونا مشکوک ہے، بنا بریں نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ اپنی کاوش کا نتیجہ نقد و نظر کے لیے حاضر خدمت کر رہا ہوں اور متوقع ہوں کہ کوتاہی اور کم نگاہی کے مواقع جو ضرور موجود ہوں گے اگر آپ کی نظر میں آئیں تو براہ کرم عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے ان پر مطلع فرمائیے گا تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کی جا سکے۔ امید ہے مطالعہ کتاب سے فارغ ہو کر آپ مصنف، مترجم، ناشر اور دیگر معاونین کے لیے دنیا و آخرت میں خیر و برکت کی دعا ضرور فرمائیں گے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

۹-۵-۱۹۸۰ء

۲۰ گلفشاں کالونی، ملتان روڈ، لاہور

سیّد شبّیر احمد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۞ البقرہ

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکاۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔"

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم

لَیْسَ الْاِیْمَانُ بِالتَّمَنِّیْ وَلَا بِالتَّحَلِّیْ وَلٰکِنْ ھُوَمَا وَقَرَ فِی الْقَلْبِ وَصَدَّقَہُ الْعَمَلُ۔ عن انس رضی اللہ عنہ۔

"مومن ہونے کی آرزو کرتے رہنے اور مومنوں کا سا حُلیہ بنا لینے سے ایمان پیدا نہیں ہوجاتا

بلکہ

ایمان وہ پختہ عقیدہ ہے جو کسی کے دل میں پوری طرح جاگزین ہوجائے اور اس کے عمل سے اس کی تصدیق ہو۔

مقدمہ طبع ثانی

ایک طرف آج دُنیا متعدد متحارب بلاکوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر بلاک دُوسرے بلاک کے خلاف گھات لگائے بیٹھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ سب ایک دشمنی اور ایک جنگ کے لیے متحد ہیں۔ اور وہ ہے اسلام سے دشمنی اور مسلمانوں کے خلاف جنگ۔ اللہ نے قرآن مجید میں اس خطرے سے ہمیں پہلے ہی آگاہ فرمادیا ہے: وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ (البقرہ ۲۱۷) "وہ تو تم سے لڑے ہی جائیں گے حتیٰ کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہیں اس دین سے پھیر لے جائیں"۔

دُوسری طرف۔ یہ جو آج دنیا وطن، زبان اور نسل کی حدود بھول کر اجتماعی، سیاسی یا فکری نظریات پر مجتمع ہو رہی ہیں۔ جبکہ یہ نظریات خود باہم متصادم اور ایک دُوسرے سے متضاد ہیں۔ یہ بھی اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو اپنے عقاید سے مُنحرف کرنے کی ایک متحدہ کوشش ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ہمارے لیے مخصوص عقیدہ اور ایک ایسا ممتاز شعار و نشان منتخب فرما رکھا ہے جو ہمیں اس ہمہ جہت جنگ میں سب سے نمایاں کیے ہوئے ہے۔ اور ہماری انفرادیت کے ختم ہونے میں مانع ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۥ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَھِیْدًا عَلَیْکُمْ وَتَکُوْنُوْا

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ؕ (الحج ۷۸) "اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام مُسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی (تمہارا نام یہی ہے) تاکہ رسول تم پر گواہ ہو، اور تم لوگوں پر گواہ۔" دُوسری جگہ ارشاد ہے

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ ۱۴۳)

اور اسی طرح تو ہم نے تمھیں ایک اُمتِ وسط" بنایا ہے تاکہ تم دُنیا کے لوگوں پر گواہ ہو۔"

لیکن دُنیا کا ہمارے خلاف محاذِ جنگ ہو یا اقوامِ عالم کے اتحاد کا معرکہ فریب۔ ہر حالت اور ہر صورت میں ہمارے کامران و سرفراز ہونے کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم مُسلمان ہوں۔

تو کیا ہم مُسلمان ہیں ؟

محمد قطب

مقدمہ کتاب

اسلام کا مفہوم ہمارے ذہنوں میں آج کیوں اس قدر مسخ ہو کر رہ گیا ہے ؟

اسلام تو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ بلکہ اسلام کا مفہوم تو درحقیقت اتنا وسیع ہے کہ اس میں صرف انسان اور اس کی زندگی ہی نہیں پُوری کائنات کے مسائل و معاملات آجاتے ہیں۔ لیکن آج یہ ہمہ گیر مفہوم سکڑ و سمٹ کر صرف عبادتوں کے چند مظاہر کا نام رہ گیا ہے جو کسی نہ کسی طرح ادا کر لیے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو ان کی ادائیگی بھی صرف بہتّر کے ذریعہ ہوتی ہے اور کبھی تو سرے سے ادا ہی نہیں کیے جاتے، نہ نیّت سے اور نہ کسی اور طریقے سے۔ اس کے باوجود ہم یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔

اسلام ایک ایسا جامع دستورِ حیات ہے جو انسان کی پوری زندگی کو منظم و مستحکم کرتا ہے اس کے اندر انسان کے تمام اقتصادی، اجتماعی، مادی، رُوحانی، سیاسی اور فکری مسائل و معاملات آجاتے ہیں اور انسان کی پوری عملی زندگی کا احاطہ کر لیتا ہے۔ لیکن آج یہ مفہوم مسخ ہو کر صرف چند پراگندہ عقائد کا نام رہ گیا ہے جن کا عملی زندگی سے کوئی رابطہ نہیں اور یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ ان عقاید کا صرف دل میں گردش کرتے رہنا ہی کافی ہے خواہ مسلمان غیر اسلامی معاشرے میں زندگی گزارتا ہے اور نہ ایسی زندگی کو ناپسند کرتا ہے اور نہ اسے بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو اس کی پُوری زندگی اسلام سے کوئی مُطابقت ہی نہیں رکھتی۔ اس کے آداب و رسوم غیر اسلامی، افکار و تصورات غیر اسلامی بلکہ اس کے روزمرّہ کے معمولات کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ مُسلمان کے انفرادی تعلقات ہوں

یا اجتماعی روابط فرد کا حکومت سے رابطہ ہو یا ملازم کا آقا سے سب غیر اسلامی ہیں۔

اسلام ایک ایسی مکمل زندگی کا نام تھا جو پوری طرح اسلامی اصول و افکار اور دین کے مثالی نمونے پر مبنی ہو جس میں دنیا و آخرت، زمین و آسمان، حاکم و محکوم، مرد و عورت اور خاندان اور معاشرے کے تمام مسائل و معاملات سما جاتے ہیں کس طرح مسخ ہو کر صرف چند منتشر و غیر مربوط جزئیات کا نام رہ گیا ہے جن میں نہ کوئی باہم رابطہ ہے اور نہ ان سے کوئی رہنمائی ملتی ہے جس طرح کپڑے میں بے میل پیوند لگے ہوئے ہوں۔

یہ عجیب و غریب فکر کہاں سے پیدا ہو گیا ہے جس کی رو سے اسلام دو حصوں میں بٹ کر رہ گیا ہے ایک طرف چند ذہنی معتقدات ہیں اور دوسری طرف انسان کی عملی زندگی ہے اور ان دونوں کا ایک دوسرے سے کوئی واسطہ نہیں ہے جس کے نتیجہ میں یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ اسلام عمل کے بغیر محض اعتقادات کا نام ہے۔ آخر مسلمانوں کے دل میں یہ بات کس طرح سما گئی کہ خواہ وہ اپنا اقتصادی نظام، اپنے معاشرتی اصول و ضوابط، اپنی روزمرہ زندگی کے تمام رسوم و رواج دنیا کے کسی غیر اسلامی معاشرے سے مستعار لے کر اپنا لیں پھر بھی وہ مسلمان رہ سکتے ہیں۔

یہ کس طرح ممکن ہو گیا کہ مسلمان یہ خیال کرنے لگا کہ وہ ہر معاملے میں اپنے رب کی تعلیمات کی خلاف ورزی اور اس کے عاید کردہ فرائض کی ذمہ داری سے بے نیاز ہو کر کھوٹ ملا سکتا ہے، جھوٹ بول سکتا ہے، خیانت کر سکتا ہے، دھوکہ و فریب کا مرتکب ہو سکتا ہے، جائز اور حلال حدود سے تجاوز کر کے حرام اور ناجائز ذرائع سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اس فائدے کے لالچ میں ہر قسم کی ذلت و رسوائی گوارا کر سکتا ہے۔ نیز اسلامی معاشرے کے قیام کی ذمہ داری سے بے نیاز رہ سکتا ہے خواہ یہ بے نیازی اس وجہ سے ہو کہ اپنے ذاتی طرز و روش میں اسلام کی پابندی نہ کرے یا اس طرح کہ اسلام کے لیے دعوت و تبلیغ ترک کر دے اور نتیجۃً وہ۔ خود ایک ایسے غیر اسلامی معاشرے کے قیام میں شریک ہو جائے

جو ظلم و نافرمانی اور گناہ پر مبنی ہو۔ اور یہ سب کچھ کر لینے کے بعد بھی وہ صدق دل یا بے دلی سے نماز کی صرف چند رکعتیں ادا کر لینے سے یہ خیال کرنے لگا ہے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو گیا ہے جو اللہ کی طرف سے اس پر عاید ہیں اور اللہ اسے مسلمانوں میں شامل فرمائے گا۔

بعینہٖ مسلمان عورت یہ کیسے تصور کرنے لگی کہ وہ اپنے رب کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اور اس کی طرف سے سپرد کردہ امانتوں میں خیانت کرتے ہوئے دھوکہ بازی کر سکتی ہے، جھوٹ بول سکتی ہے، حسد و غیبت کر سکتی ہے، سر راہ ننگی نکل کر ہر تشنہ آنکھ اور شہوت پرست جسم کے لیے اپنے فتنے بکھیر سکتی ہے۔ اور یہ خیال کرتی ہے کہ اسلامی معاشرے کے قیام کی کوئی ذمہ داری اس پر عاید نہیں ہوتی خواہ یہ ذمہ داری اس کے اپنے ذاتی درست عمل سے متعلق ہو، خواہ اپنی اولاد کی اسلامی تربیت سے متعلق ہو اور خواہ یہ ذمہ داری اسلامی معاشرے کے قیام کی دعوت سے متعلق ہو، جب کہ اپنے اس طرز و روش کی وجہ سے وہ خود ایک ایسے معاشرے کے قیام میں حصہ دار بن جاتی ہے جو ظلم و جور اور گناہ پر قائم ہے۔ اور پھر بھی اسے یہ خیال رہتا ہے کہ محض اس نیتِ خیر کی وجہ سے جو اس کے دل کے اندر کہیں موجود ہے اللہ تعالےٰ کے حضور اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جائے گی اور اسے مسلمانوں میں شامل کر لیا جائے گا۔

یہ اجنبی تصورات کہاں سے آ گئے کہ کہا جانے لگا۔ دین کا معاشرتی نظم و نسق سے اور اقتصادیات سے کیا رابطہ، دین کا فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق سے یا فرد اور حکومت کے تعلق سے کیا ناطہ بلکہ دین کا انسان کی حقیقی زندگی کے عملی طرز و روش سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ اسی طرح دین اور رسم و رواج میں کوئی رابطہ نہیں، دین کا لباس سے کوئی تعلق نہیں خاص طور پر عورت کے لباس سے، اسی طرح دین کا آرٹ سے، صحافت سے، ریڈیو، سینما اور ٹیلی ویژن سے کوئی واسطہ نہیں۔ مختصراً یہ کہ گویا دین کو زندگی سے اس حقیقی اور

حسی زندگی سے جو انسان دُنیا میں گزارتا ہے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں، دین اور زندگی دو علحدہ علحدہ چیزیں ہیں۔

در حقیقت اس ہمہ جہت خرابی کے جو اسلام کو مسلمانوں میں برداشت کرنا پڑ رہی ہے متعدد اسباب ہیں اس لیے کہ اسلامی معاشرہ جب تک حقیقی اسلام پر عامل رہا ایسا نہ تھا بلکہ تعیین وقت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مسلم معاشرہ ماضی قریب میں یعنی فرانسیسیوں کے حملے سے پہلے تک باوجود اپنی بہت سی خرابیوں کے جو گزشتہ طویل اَدوار میں اس میں پیدا ہو چکی تھیں، ایسا نہ تھا۔

اگرچہ اسلامی تاریخ میں دین کے شالی احکام اور عملی زندگی میں تفریق کی ابتدا بہت پہلے یعنی اموی عہد میں ہی پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن یہ ایسی تفریق تھی جس کی وجہ سے مجموعی طور پر اسلامی معاشرہ کے اصول وضوابط میں خلل واقع نہیں ہُوا تھا۔

حکومت، دارالخلافہ میں رہتے ہوئے حکومتی اور مالی معاملات میں کچھ جزوی خرابی کا ارتکاب کرتی تھی لیکن دارالحکومت سے باہر کا معاشرہ بڑی حد تک اسلام کے اصول وقواعد پر کاربند تھا۔ اور معاشرتی زندگی کے چھوٹے بڑے امور میں ان پر اسلام کی ہی حکمرانی تھی۔ اہم تر بات یہ ہے کہ بنیادی طور پر پورے معاشرے کا نظام اسلام پر مبنی تھا اور معاشرے کے تمام قوانین کا ماخذ اسلامی شریعت کے سوا کوئی اور نہ تھا۔ پھر جب تُرکوں کا دَور آیا تو دین و دنیا میں تفریق کے نظریہ میں وُسعت پیدا ہوئی لیکن اس کے باوجود معاشرے کے اکثر و بیشتر اُمور اور معاشرے کا ذہن خالص اسلامی رہا۔ عملاً بھی اخلاق و معاملات اور تصورات و افکار سب اسلام ہی کے زیر اثر رہے۔

یہاں تک کہ جب اٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں آخری صلیبی جنگ کا سلسلہ شروع ہُوا جو بیسویں صدی تک پھیل گیا اس وقت سے مسلم معاشرے میں شدید خلل پیدا ہُوا اور زندگی اور دین میں تفریق حد سے بڑھ گئی۔

اس کتابچہ کا مقصدِ تصنیف اُن اسباب و وُجوہ کا جائزہ لینا ہے جن کی وجہ سے اسلام کا انتہائی جامع اور وسیع مفہوم ٹکڑے ٹکڑے کر اتنا مسخ ہوگیا کہ وہ اب صرف چند منتشر جزئیات کا نام رہ گیا ہے جن میں نہ کوئی باہم رابطہ ہے اور نہ جن سے کوئی رہنمائی ملتی ہے یا اب وہ محض چند پُرخلوص یا غیر مخلصانہ عبادات ہیں جن کے ادا کرنے والے یہ خیال کرتے ہیں کہ یہی مکمل اسلام ہے اور وہ اپنے رب کے پاس یہی عبادتیں لے کر جائیں گے اور انہی کی بنا پر وہ ان سے راضی ہو جائے گا اور یہ اس سے خوش۔ حالانکہ خود اللہ تعالیٰ اپنی کتابِ حکیم میں فرماتا ہے کہ یہ وہ اسلام نہیں ہے جو اس کا منشا و مُراد تھا۔

جب ہمیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ یہ خرابی کیسے پیدا ہوئی اور کس طرح بڑھی اور پھیلی تو شاید ہم اس پُرفریب چکر کو سمجھ کر پھر اللہ کی طرف رجوع کریں اور اپنا جائزہ لیں اور پھر سے مسلمان بن جائیں۔

اور اللہ تعالیٰ اس چیز کی توفیق عطا فرماتا ہے جس کا بندہ ارادہ کرتا ہے۔

محمد قطب

اسلام کا حقیقی مفہوم

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اسلام کے کیا معنیٰ سمجھے تھے؟ اور ہمیں کس انداز میں سمجھنے چاہئیں؟

ایک بات یقینی ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اسلام کو اس معنیٰ میں ہرگز نہیں لیا تھا جو معنیٰ آج ہم سمجھتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اسلام چند عبادات کے مجموعے کا نام ہے جو انسان ادا کرتا ہے اور اس کا زندگی کے دوسرے مسائل و معاملات سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ اور یہ کہ انسان کے لیے یہ دو عملی جائز ہے کہ ایک خاص وقت میں یعنی عبادت کے وقت تو وہ پورے خلوص کے ساتھ اللہ سے لو لگائے پھر زندگی کے دیگر مسائل و معاملات میں غیر اللہ کی طرف دھیان رکھے۔ اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرام اور تابعین عظام رضوان اللہ علیہم نے اسلام کے یہ معنیٰ سمجھتے تھے کہ انسان اپنی ذات کو پوری طرح اللہ کے سپرد کر دے اور اس کا پورا وجود اللہ کی جانب متوجہ ہو جائے یعنی اس کے افکار و احساسات اور عملی زندگی کے تمام پہلو قانونِ الٰہی کے تابع ہو جائیں۔ ہمارے اسلاف کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کو صرف زبان سے ادا کیا جانے والا ایک جملہ نہیں خیال کرتے تھے جس کے مفہوم و معنی کا دل کی گہرائیوں اور عملی زندگی پر کوئی نتیجہ اور اثر مرتب نہ ہو۔ بلکہ ان کے نزدیک لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم یہ تھا کہ حضرت اللہ تعالیٰ ہی تنہا و یکتا اس پوری کائنات کا مالک ہے۔ کائنات میں وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات و حادثات کا مؤثرِ حقیقی اور منصوبہ ساز بھی صرف وہی ہے۔ نتیجۃً محض اس کی عبادت کی جانی چاہیے اور ضروری ہے کہ سب کے دل خشیت و تقویٰ کے ساتھ اسی کی جانب

متوجہ ہوں۔ صرف وہی زندگی کی نعمت عطا کرنے والا اور موت کا فیصلہ فرمانے والا ہے اور صرف وہی رزق عطا فرمانے والا ہے زبردست قوت کا مالک۔ نیز انھوں نے لا الٰہ اللہ کے یہ معنی بھی سمجھے تھے کہ غیر اللہ کی طرف عبادت کے کسی انداز میں متوجہ ہونا یا غیر اللہ سے خوف کھانا اور یہ گمان رکھنا کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا یا زمین و آسمان کی کوئی اور قوت انسانوں کو نفع یا نقصان پہنچا سکتی ہے شرک ہے اور یہ لوگ اس شرک سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے اس پر مستزاد انھوں نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ سے یہ معنی بھی سمجھے تھے کہ ذات باری تعالیٰ ہی واحد مالک و حاکم ہے جو انسانوں کے لیے شریعت نافذ فرماتا اور ان کی زندگی اور معیشت کے لیے قانون و دستور وضع فرماتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور شخص یا زمین و آسمان کی کوئی اور قوت ایسی نہیں ہے جو یہ کام سرانجام دے سکے۔ اور یہ کہ مندرجہ بالا اصول اور فیصلہ نیا نہیں ہے بلکہ ابتدائے آفرینش سے اور انسانیت کے وجود میں آنے سے پہلے ہی طے کر دیا گیا تھا۔ بلکہ جب حضرت آدمؑ زمین پر اُتارے گئے اسی وقت یہ بات بتا دی گئی تھی: قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرہ ۳۹) "ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اُتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔ اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔"

اسی طرح قرنِ اول کے مسلمانوں نے محمد رسول اللہ کی شہادت دینے کے یہ معنی سمجھے تھے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ رسول ہیں جن کو اس رسالتِ عظمیٰ اور اس ہدایت کی تبلیغ کے لیے قابلِ اعتماد سمجھا گیا۔ جس کی پیروی اور جس پر عمل کرنا انسان پر لازم ہے اور آپ ہی اللہ کے پیغام رساں ہیں اور آپ کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت کی مانند ضروری ہے

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء ۶۴) "ہم نے جو رسول بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔"

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر ۷) "جو کچھ رسول تم کو دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں اس سے باز آجاؤ۔"

وہ لوگ یہ بات بھی سمجھتے تھے کہ صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہی پیغامِ الٰہی کی زندہ تعبیر و تفسیر ہے اور آپ ہی انسانوں کے لیے ہر اقدام اور ہر عمل میں رہنما ہیں۔ آپ جماعتِ مسلمہ کے قائد بھی تھے اور تربیت دینے والے استاد اور معلم بھی۔ آپ ہی وہ نورِ کامل تھے جس سے انسان اپنی زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی حاصل کر سکتا ہے۔

درحقیقت یہ تھا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینے کا ایک عام اور مجمل مفہوم۔ یہی مفہوم جب کسی کے دل میں پوری طرح جاگزین ہو جائے تو اسے صحیح مسلمان سمجھا جا سکتا ہے اور یہی مفہوم اسلام کی وہ مثالی حقیقت ہے جو اگر کسی انسان کے دل میں پیوست ہو جائے تو اس کی زندگی یکسر تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ صراطِ مستقیم یعنی اللہ تک پہنچانے والے راستے پر چل پڑتا ہے۔

کلمہ طیبہ کے اسی مجمل مفہوم سے یا یوں کہہ لیں کہ اس کے ساتھ قرآن مجید کی مفصل توجیہات اور آں حضرت صلی اللہ کی عملی زندگی کی روشنی میں مزید متعدد تصورات وجود میں آئے جو ہمارے اسلاف کے دلوں میں گہرے اُترے ہوئے تھے اور ان کے فکر و شعور اور ان کے عمل میں ان کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی تھی۔ اگرچہ انھوں نے ان تصورات پر ہماری طرح کوئی فلسفہ تعمیر نہیں کیا تھا اور نہ ان موضوعات پر ہماری مانند ضخیم کتابیں تصنیف کی تھیں۔

یہ لوگ پوری طرح سمجھتے تھے کہ محض دل میں پوشیدہ نیت اسلام نہیں ہو سکتی۔

اور جب تک اس نیت کے واضح اثرات عملی زندگی اور انسان کے واقعی طرز و روش میں پوری طرح ظاہر نہ ہونے لگیں۔ حقیقت میں یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہیں ہے کیونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: لَيْسَ الْإِيْمَانُ بِالتَّمَنِّيْ وَلَا بِالتَّحَلِّيْ وَلٰكِنْ هُوَ مَا وَقَرَ فِي الْقَلْبِ وَصَدَّقَهُ الْعَمَلُ =

(عن انس رضی اللہ عنہ) مومن ہونے کی آرزو کرتے رہنے اور مومنوں کا سا حلیہ بنا لینے سے انسان مومن نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ایمان وہ پختہ عقیدہ ہے جو انسان کے دل میں پوری طرح جاگزیں ہو جائے اور انسان کے عمل سے اس کی تصدیق ہوتی رہے۔ (حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت)۔

آج جب کہ ہمیں فلسفہ، بالخصوص علم النفس پر وسیع عبور حاصل ہے ہم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں بیان کردہ حقیقت کی صداقت کا اور حیاتِ انسانی پر اس کے عمیق اثرات کا بخوبی ادراک کر سکتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان بسا اوقات یہ محسوس کرتا ہے کہ کسی خاص نظریہ کے بارے میں وہ پوری طرح مطمئن ہے اور اس سلسلے میں وہ اتنا کچھ جانتا ہے کہ مزید کچھ اور جاننے کی ضرورت یا گنجائش نہیں رکھتا۔ ایسی صورت میں وہ یہ ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا کہ اس کے متعلق بطور خود مزید سوچے یا کوئی دوسرا اس سے اس موضوع پر گفتگو کرے کیونکہ وہ خیال کرتا ہے کہ یہ مسئلہ تو اس کے دل اور ذہن کی گہرائی میں پوری طرح جاگزیں اور طے شدہ ہے اور اسے اس کے سلسلے میں کسی طرح کا شک یا الجھن باقی نہیں ہے۔ لیکن پھر کچھ عرصے کے بعد اس پر منکشف ہوتا ہے کہ اس کا یہ خیال محض ایک فریب تھا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا یا اگر اس کی کچھ حقیقت تھی بھی تو وہ نظریہ اس کے ذہن میں اتنا طاقت ور تھا کہ زندگی کی گاڑی کو اس کے مطابق چلایا جا سکتا۔

آپ کبھی بیٹھے بیٹھے یہ خواب دیکھنے لگتے ہیں کہ آپ ایک دھکے سے پوری کائنات

کو حرکت دے سکتے ہیں لیکن پھر جب آپ واقعتاً محض ایک میز کو سرکانے لگتے ہیں تو آپ محسوس کرتے ہیں کہ اس کا ہٹانا مشکل ہے اور اس مقصد کیلیے آپ کو مزید قوت درکار ہوگی۔ یا اس کام کے لیے آپ کے اندرونی شوق و خواہش کی شدت میں اضافہ کی ضرورت ہے تاکہ پہلے آپ خود میں میز کی طرف سے ہونے والی مزاحمت کے برابر قوتِ مدافعت پیدا کر سکیں پھر مزید قوت میں اضافہ ہو اور جتنا قوت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اتنی ہی خارجی دنیا میں حقیقی حرکت بڑھتی جائے گی اور یہ حرکت ہی دراصل ذہن میں موجود جذبہ و قوت کا صحیح پیمانہ ہے۔

یہ حقیقت صرف انسان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ کائنات کی حقیقتِ کبریٰ ہے اور قانون وجود کا ایک مسلّمہ اصول ہے۔

مشین کے ہر موجد کو یہ اصول بخوبی معلوم ہے کہ صرف کسی چیز کے اندر پوشیدہ قوت حرکت کے لیے کافی نہیں ہوتی بلکہ حرکت کے لیے ضروری ہے کہ اندرونی قوت پہلے خارجی قوت میں تبدیل ہو یعنی نیت عمل میں آئے پھر اس میں مزید اتنا اضافہ ہو کہ صرف مقابلہ اور مدافعت ہی نہ کرے بلکہ اس سے بڑھ جائے تب کہیں وہ حرکت پیدا ہوگی جو حقیقی زندگی میں مطلوب ہے۔

دراصل حرکت جو اس کائنات کا عظیم قانون ہے، اسی اصول پر قائم ہے کہ پہلے پوشیدہ قوت خارجی اور ظاہری قوت میں تبدیل ہو پھر اس قوت میں اتنا اضافہ ہو کہ مدافعت پر غالب آکر سمت مطلوبہ میں آگے بڑھ سکے۔

نفس انسانی بھی جو خود اس کائنات کی ایک قوت ہے اسی قانون کے مطابق رُوبہ عمل ہے کیونکہ کائنات کی عظیم قوتوں کے ضمن میں مادیات اور معنویات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جدید سائنس کے نقطۂ نگاہ سے مادہ اور قوۃ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔

مذکورہ بالا اصول کے مطابق یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ محض نیت کافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ صرف ایک ایسی پوشیدہ قوت ہے جو حرکت نہیں بنی اور عمل میں تبدیل نہیں ہوئی اور جسے ابھی رکاوٹوں سے مقابلہ کا تجربہ حاصل نہیں ہوا۔ اب قابل غور یہ امر ہے کہ

انسانی زندگی میں وہ کون سی طبعی رکاوٹیں ہیں جن کی مدافعت محض نیت نہیں کرسکتی اور جن سے مقابلہ کے لیے پہلے نیت کو حقیقی قوت میں تبدیل کرنے اور پھر اس قوت میں مزید اضافہ کی ضرورت ہے تاکہ زندگی میں حقیقی حرکت پیدا ہو سکے۔

یہ رکاوٹیں بہت سی ہیں۔ کچھ تو نفسِ انسانی کے اندر پوشیدہ ہیں اور کچھ عملی اور خارجی زندگی میں موجود ہیں۔

نفس کے اندرونی موانع یہ ہیں: لگاؤ، عادت، رسم و رواج، آرام دہ زندگی کی خواہش اور مشقت سے نفرت، تکلیف اور خطرات سے فرار وغیرہ۔ اگر ان سب کو یکجا کرکے انھیں ایک نام دینا چاہیں تو ہم اسے "ہویٰ" کہہ سکتے ہیں۔ یعنی نفس کی پسندیدہ خواہشات کو پورا کرنے کی رغبت۔

اور عملی زندگی میں جن رکاوٹوں سے واسطہ پڑتا ہے ان میں سے ایک تو ظالم سماج ہے اور دوسری وہ سرکش قوتیں ہیں جو اکثر معاشرے میں پائی جاتی ہیں اور اس پر قبضہ جما لیتی ہیں۔ ان قوتوں کو مجموعی طور پر اگر ایک عنوان دینا چاہیں تو انھیں "طاغوت" کہا جائے گا یعنی ہر وہ قوت جو اپنی حد سے بڑھ جائے اور خطِ مستقیم سے تجاوز کر جائے۔

نفس کے اندر "ہویٰ" اور خارجی دُنیا میں "طاغوت" دو ایسی رکاوٹیں ہیں جن سے مزاحمت کے لیے ضروری ہے کہ نیت پہلے ایسی حقیقی قوت بنے جو ان کا مقابلہ کر سکے۔ پھر اس قوت میں مزید اضافہ ہو تاکہ ایسی صحیح اور مثبت حرکت وجود میں آ سکے جو قانونِ قدرت اور اللہ کے ارادے سے ہم آہنگ ہو۔

نفس کی اندرونی دُنیا میں "ہویٰ" اور خارج میں "طاغوت" دو وزن دار دباؤ اور مزاحمت رکھنے والی حقیقی اور واقعی قوتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محض نیت ان کی مدافعت کے لیے ناکافی ہے چہ جائیکہ ان پر غالب آجائے اور راہِ راست پر چلنے کے لیے حرکتِ مستقیم پیدا کر سکے۔

یہ انسانی نفسیات اور زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے جس کا ادراک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری طرح تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: کہ مومن ہونے کی آرزو کرتے رہنے اور مومنوں کا سا حُلیہ بنا لینے سے ایمان پیدا نہیں ہو جاتا بلکہ ایمان وہ پُختہ عقیدہ ہے جو انسان کے دل میں جاگزیں ہو جائے اور انسان کے عمل سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اسی طرح آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو بھی اس حقیقت کا پوری طرح ادراک تھا۔ اسی لیے وہ خود کو اس طریقے پر قائم رکھنے کے لیے مجاہدے اور معاشرے کو اسلامی اصولوں پر برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کیا کرتے تھے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حقیقی زندگی میں پُرخلوص نیک نیتی کا مقام اور وزن کیا ہے؟ یا یُوں کہیے کہ اس میں خرابی کیا ہے؟

اس میں خرابی یہ ہے کہ یہ ایک فریب ہے۔ اس کی وجہ سے آپ تصور میں یہ فرض کر لیتے ہیں کہ آپ ایک جھٹکے سے پُوری کائنات کو حرکت میں لا سکتے ہیں جبکہ عملاً آپ کو یہ تجربہ بھی نہیں کہ زمین پر ایک میز کو حرکت دینے کے لیے کتنی قوت درکار ہوتی ہے۔

آپ پُورے خلوص کے ساتھ یقین رکھتے ہیں کہ آپ کا قلب پاکیزہ ہے، ضمیر صاف ہے، طبیعت بالکل سیدھی ہے اور اللہ سے لَو لگائے ہُوئے اس کی رضا پر عمل کر رہے ہیں۔ ہم تسلیم کیے لیتے ہیں لیکن جب آپ سے تقاضا ہو کہ اللہ کی رضا کے خیال سے اپنے نفس کی کسی خواہش کو ترک کر دیں، اپنی روش اور عادت بدل دیں یا اس معاشرے کے رسم و رواج تبدیل کر دیں جس میں آپ رہ رہے ہیں۔ اور مطالبہ ہو کہ لوگوں کے سامنے ڈٹ جائیں تاکہ یا تو ان کو غلط راہ پر چلنے سے روک سکیں یا انھیں اپنی راہ سے اس طرح ہٹا سکیں کہ کم از کم وہ آپ کو صراطِ مستقیم سے منحرف کرنے پر قادر نہ ہو سکیں اور اس سلسلے میں آپ کو جس قدر اذیت و تکلیف پہنچے اسے برداشت کریں۔ اسی طرح جب آپ سے مُطالبہ کیا جائے کہ آپ طاغوت کا (کسی قسم کے طاغوت کا) آگے بڑھ کر مقابلہ کریں خواہ اس

سلسلے میں آپ کی زندگی خطرات میں گھر جائے۔ اس وقت آپ کا مؤقف کیا ہوگا؟ دراصل اسی وقت پتہ چلے گا کہ دل میں پوشیدہ نیک نیتی کی حقیقی مقدار اور وزن کیا ہے۔

یہ درست ہے کہ دل میں پوشیدہ مخلصانہ نیت کے بغیر کسی عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ لیکن خود نیت کی بھی کوئی وقعت و حیثیت نہیں ہے جب تک یہ ایک غالب قوت بن کر حقیقی زندگی میں مؤثر کردار ادا نہ کرے۔ چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم حد درجہ حقیقت پسند شخصیت تھے اسی لیے آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: مومن ہونے کی آرزو کرتے رہنے اور مومنوں کا سا حُلیہ بنا لینے سے ایمان پیدا نہیں ہو جاتا۔ بلکہ ایمان وہ پختہ عقیدہ ہے جو انسان کے دل میں پُوری طرح جاگزین ہو جائے اور انسان کے عمل سے اس کی تصدیق ہوتی رہے۔

دل میں پوشیدہ نیک نیتی کا حقیقی حاصل یہی ہے کہ اس کی وجہ سے ھویٰ نفس اور طاغوت سے مقابلہ کی قُدرت پیدا ہو۔ اگر یہ نیّتِ خیر ھویٰ و طاغوت سے مزاحمت و مدافعت کی قوت نہیں بنتی تو اس کی حیثیت ایک خوش منظر حباب سے زیادہ نہیں جو چھُوتے ہی ٹوٹ کر فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

اسی لیے اسلام نے محض نیک نیتی کو کبھی کافی نہیں سمجھا کہ آپ نیک نیت لے کر بیٹھے رہیں اور حقیقی زندگی میں کوئی نتیجہ خیز عمل سرانجام نہ دیں اور مسلمان بھی رہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (وہ لوگ جو ایمان لائے) فرمایا گیا ہے اس کے ساتھ ضرور وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (اور جنھوں نے نیک کام کیے) کی شرط بھی موجود ہے۔ یعنی ایمان وہ ہے جو قلب میں جاگزین ہو اور عمل سے اس کی تصدیق ہوتی رہے۔

اور اسی بنا پر اسلام دینِ فطرت ہے۔ کیونکہ یہ دین ہمیشہ فطرتِ کائنات اور قانونِ موجودات کے ساتھ ہم آہنگ رہتا ہے۔

اور یہی (کہ محض نیتِ خیر عمل کے بغیر کافی نہیں) وہ واضح حقیقت ہے جو دَورِ اول کے مسلمانوں نے اسلام کے مفہوم میں پالی تھی۔ اور اسی حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہونے کی وجہ سے ہی یہ لوگ اسلامی فکر کو عمل کی دنیا میں ٹھوس حقیقت بنانے کی جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ اور خوش کُن آرزوؤں اور فضا میں مُعلّق مثالی نظریات کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے زندگی کی انفرادی طرز و روش کو اسلام کے مطابق بنانے کے لیے بھی کام کیا تھا اور حقیقی دُنیا میں اسلامی معاشرہ وجود میں لانے اور عملاً اسلامی ریاست قائم کرنے کے لیے بھی ہر قسم کی جدوجہد کی تھی۔

دَورِ اول کے مسلمانوں میں سے کسی کے ذہن میں کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ کوئی شخص عملی زندگی میں اسلام کے خلاف طرزِ و روش اختیار کرتے رہنے کے باوجود محض اچھی نیّت رکھنے کی وجہ سے اس بنا پر مسلمان ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کا مالک ہے، نفسِ انسانی کے خفیہ گوشوں اور رازوں سے واقف ہے اور اعمال کے پیچھے کارفرما نیّتوں سے باخبر ہے بلکہ انھوں نے یہ حقیقت بخوبی سمجھ لی تھی کہ نیت اور عمل ایک ہی شئے کے دو رُخ ہیں۔ جب تک دونوں موجود نہ ہوں محض ایک رُخ سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ محض حُسنِ نیّت عمل کے بغیر ایک کھوکھلی تمنا ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اسی طرح نیتِ خیر کے بغیر کیا گیا عمل بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف اسی عمل کو قبول فرماتا ہے جس کا مقصد محض اس کی رضا حاصل کرنا ہو۔ دراصل حُسنِ نیّت کے یہی معنیٰ ہیں۔ ویسے بھی خود دنیوی پیمانے نیت کے کھوٹ کو ظاہر کر دیتے ہیں اگرچہ اس میں کچھ وقت لگتا ہے۔

دَورِ اول کے کسی مسلمان نے کبھی یہ تصور نہ کیا تھا کہ وہ محض حُسنِ نیّت کی بنا پر مسلمان ہو سکتا ہے جبکہ وہ زندگی کے کسی ایک بھی معاملے میں مثلاً آسانی سے حاصل ہو جانے والے مالِ غنیمت کو ترجیح دینے یا آسائش و آرام کی زندگی اختیار کرنے یا محنت و مشقت اور خطرات سے جان بچانے میں اپنی خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کر رہا ہو یا یہ کہ کوئی شخص (محض حُسنِ نیّت

کی بنا پر مسلمان ہو سکتا ہے) درانحالیکہ وہ کسی غیر اسلامی معاشرے کی خواہ یہ معاشرہ برسرپیکار ہو یا نہ ہو، اس کی روایات اور انحرافات میں تقلید کر رہا ہو اس غرض سے کہ اسے آرام ملے یا اس معاشرے میں اسے کوئی مرتبہ و مقام اور عزت و احترام حاصل ہو جائے یا اپنی ذات کو اذیت سے بچانا مقصود ہو خواہ یہ اذیت لوگوں کے لعن وطعن اور تحقیر و استہزاء کی وجہ سے ہو یا مادی اذیت ہو جو روزی سے محروم کر دے یا اس کی زندگی معرضِ خطر میں ڈال دے۔

انھوں نے یہ نکتہ پا لیا تھا کہ اسلام کے معنیٰ ہی اسلامی احکام کو عملی زندگی میں بروئے کار لانا ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ لازمی طور پر ہر مسلمان کی انفرادی طرز و روش بھی اسلام کے مطابق ہو خواہ اس کی وجہ سے کتنے ہی خطرات کیوں نہ لاحق ہوں اور اسی طرح وہ معاشرہ بھی جو ایسے افراد سے تشکیل پائے خالص اسلام کے مطابق ہو خواہ اس سلسلے میں کتنے ہی خطرات سے دوچار ہونا پڑے۔

یہاں اس حقیقت کی نشان دہی ضروری ہے کہ نفسِ انسانی ہمیشہ ایک ہی نہج پر قائم نہیں رہتا اور ہر وقت مصائب و مشکلات سے مقابلہ کرنے کی قدرت نہیں رکھتا بلکہ کبھی نہ کبھی کسی ایک یا دوسرے عمل میں کمزوری اور کوتاہی کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے: وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا۔ (النساء ۲۸) "انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔" اور چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کمزوریوں سے باخبر ہے اس لیے اگر بندے گناہ پر اصرار نہ کریں تو وہ ان کی لغزشوں سے درگزر فرما کر ان کی توبہ قبول کر لیتا ہے ملاحظہ ہو: وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۳۴ۚ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۵ آل عمران "ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔ اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً

اللہ انھیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو۔ اور وہ دیدہ دانستہ اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔"

لیکن (قرآن کی بیان کردہ) اس قطعی حقیقت میں (کہ انسان کمزور ہے) اور محض حسنِ نیت کو زندگی اور اسلام کے لیے کافی سمجھ لینے میں بہت فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے اُن بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اپنے ان بندوں پر رحم فرمانے کو اس نے اپنے پر لازم قرار دیا ہے جو مخلصانہ نیت کو حقیقتاً نتیجہ خیز عمل میں بدلنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور اگر اس کوشش میں ان سے لغزش ہو جاتی ہے تو وہ اس لغزش پر اصرار نہیں کرتے پھر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اللہ سے عفو و درگزر کے لیے رجوع کرتے ہیں تب اللہ تعالیٰ ان پر احسان فرماتا ہے اور ان سے راضی ہو کر معاف فرما دیتا ہے۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰۗىِٕكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ الفرقان (۷۰) "مگر جس نے توبہ کی ایمان لایا اور عمل صالح کیے تو یہی لوگ ہیں جن کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

قرونِ اولیٰ کے مسلمان یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اس طرح بھی مسلمان ہو سکتے ہیں کہ ان کی نیت نیک ہو اور غیر اسلامی معاشرے کو اُسی حالت میں رہنے دیں جیسا وہ ہے اگرچہ خود اس کی غلط روش میں اس کا ساتھ نہ دیں اور اس کی بدی میں شریک نہ ہوں۔ بلکہ ان کے نزدیک مسلمان ہونے کے معنیٰ یہ تھے کہ وہ اس نافرمان معاشرے کو ایسے فرماں بردار معاشرے میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور اللہ کے نازل کردہ قوانین پر کاربند ہو۔ اور وہ اگر ایسا نہیں کریں گے تو وہ مسلمان نہیں ہو سکیں گے۔ ان کی تمام تر جد و جہد دراصل اسلام کے مفہوم کی اسی واضح حقیقت کو سمجھ لینے کا نتیجہ تھی۔

اسلام ایک حرکت کا نام ہے جو نفس کے اندر اور حقیقت کی دُنیا میں بیک وقت وقوع پذیر ہوتی ہے بنا بریں یہ ناممکن ہے کہ اسلامی عقیدہ مسلمان کے دل میں تو جاگزین ہو جائے اور حقیقی زندگی میں اس کے اثرات ظاہر نہ ہوں۔ یہی وہ تحریک تھی جو دورِ اوّل کے اسلامی معاشرے میں پیدا ہوئی تھی۔ چنانچہ ان چند مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کے جاگزین ہو جانے سے جنھیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سامنے تربیت فرما کر اسلام کے مطابق تیار کیا تھا۔ اسلام کی تحریک اس جاہلی اور باغی معاشرے کے دلوں تک پہنچ گئی جسے یہ لوگ اللہ کی عبادت کی طرف لوٹانا چاہتے تھے اور ان گمراہ دلوں کو ہدایت عطا کی جن کی ہدایت مقصود تھی، اور اس زمانے کی پست اور فرسودہ قدروں کو رفعت و عظمت بخش کر اس معیار تک پہنچا دیا جو انسان کے لیے مناسب تھا اور اپنی اس جدّوجہد کے تمام مراحل میں یہ لوگ اللہ و رسول کی ہدایت پر کاربند رہے اور ہر موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی کے نمونے کو پیشِ نظر رکھا۔ اور یہ لوگ اپنے اس مقصد میں اس لیے کامیاب ہُوئے کہ انھوں نے ایسا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اور دل میں پختہ ارادہ کر لینے کے بعد اس کو خارجی دُنیا میں حقیقت بنانے کے لیے بھرپُور کوشش کی تھی۔ گویا اس طرح یہ لوگ مسلمان بنے تھے۔

جن حقیقتوں کا قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کو پورا پورا ادراک تھا ان میں سے ایک یہ تھی کہ اسلامی معاشرے کو ہر حالت میں قانونِ الٰہی کی بنیاد پر قائم ہونا چاہیے۔ اللہ کے قانون سے علٰحدہ ہو کر معاشرے کا اسلامی ہونا ناممکن ہے اور اسلامی معاشرہ طویل مدّت تک اس حقیقت پر قائم رہا اور یہی اس معاشرے کا امتیازِ خصوصی تھا جس کی وجہ سے وہ دوسرے تمام معاشروں سے الگ پہچانا جاتا تھا۔

تاریخ اسلام میں ان اصولوں پر قائم ہونے والے معاشرے کا یہ امتیازِ خصوصی اسلامی تاریخ کے ہر مطالعہ کرنے والے کو نظر آیا ہے۔ یہاں تک کہ ان مستشرقین کو بھی جن کی کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ کسی طرح اس مستحکم بنیاد کو ڈھا کر اسلامی معاشرے کو قانونِ شریعت

سے جُدا ثابت کر سکیں (جیسا کہ ہم کتاب میں آگے چل کر بتائیں گے) ان مستشرقین نے بھی اسلامی معاشرے کے اس امتیازِ خصوصی کی قوت کو اور اسلامی معاشرے کی بنیادوں میں اس کی گہرائی اور شدید پیوستگی کو بخوبی محسوس کر لیا ہے۔ پروفیسر "گب" اپنی کتاب (MODREN.TRENDS.IN.ISLAM) میں لکھتا ہے: "انسانوں کی کوئی جماعت اپنے لیے جو معاشرہ تشکیل دیتی ہے اس کی نوعیت بنیادی طور پر اُن عقاید پر موقوف ہوتی ہے جو اس جماعت کے کائنات کی حقیقت، اس کے وجود کی غرض و غایت اور کائنات میں نفس انسانی کے مقام کے بارے میں ہوتے ہیں۔ یہ خاصا جانا پہچانا نظریہ ہے۔ کلیساؤں میں اسے ہر ہفتہ بیان کیا جاتا ہے لیکن غالباً صرف اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے معاشرے کو اس اصول پر استوار کرنے کی بالارادہ مستحکم کوشش کی ہے۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا اس کے پاس سب سے بڑا ذریعہ شریعتِ اسلامیہ تھی۔"

نیز "وان گروفیام" اپنی کتاب "اسلام" میں لکھتا ہے: "جس چیز کا ادراک حاصل کرنے کے لیے ابتدائی دور کے مسیحیوں نے صدیاں صرف کی تھیں وہ بات (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چند ہی سالوں میں پا لی تھی اور وہ یہ کہ جب یہ امر اللہ کی مشیّت کا اقتضا ہے کہ دنیوی زندگی (قلیل یا کثیر) عرصہ تک زمین میں قائم رہے تو یہ بات بھی ضروری ہے کہ آپ کی جماعت (اسلامی معاشرہ) اس عرصہ میں اپنی زندگی وحی الٰہی کی تعلیمات کے مطابق گزارے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی جماعت کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ وہ وحیِ الٰہی کی روشنی میں ایسا جامع دستورِ حیات تیار کرے جس میں انسانی زندگی کے تمام پہلو (پیدائش سے دفن تک) پوری طرح سموئے ہُوئے ہوں یعنی وہ دستورِ زندگی کے تمام فکری، معنوی، تصوری، عملی اور مادی امور پر مشتمل ہو۔ اس میں مظاہرِ حیات کے سلسلے میں دینی اور دنیوی کی تفریق نہ ہو۔ اور جو اس زندگی کے تمام مسائل کو دین کے رشتہ میں باہم مربوط کر دے اور زندگی کا ہر کام خواہ اس کی نوعیت کیسی ہو اپنی تکمیل کے لیے دینی مراسم کا محتاج ہو۔ اس طریقہ کار سے نہ صرف عملی زندگی میں ایک قسم

کی وحدت پیدا ہوگئی بلکہ پُوری زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے مسئلہ کو دینی رہنمائی کی وجہ سے رفعت وعلو حاصل ہوگیا۔ اور پھر اس کی صورت یہ نہ تھی کہ صرف افراد کی زندگی ایسے اعمال کا مجموعہ بن جائے جو انسان سے اللہ کو مطلوب ہیں بلکہ اسلامی معاشرے کے لیے مجموعی طور پر اللہ کا مثالی معاشرہ ہونا ضروری قرار پایا۔ چنانچہ حکومت لشکر اور خزانہ (بیت المال) اللہ کی حکومت، اللہ کا لشکر اور اللہ کا خزانہ کہلانے لگے۔"

نیز "ولفرڈ کانٹول اسمتھ" (WILFRED. CANTWELL SMITH) اپنی کتاب ISLAM. INMODREN HISTORY کے مقدمہ میں لکھتا ہے: "چونکہ اسلامی دنیا کا پہلا امتیازی نشان یہ ہے کہ وہ اسلامی ہے۔ اس لیے ہم یہاں پہلے اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ دراصل اس "حقیقت" سے مُراد کیا ہے"۔ پھر آگے چل کر اسی کتاب کے باب "اسلام اور تاریخ" میں صفحہ ۲۶ - ۲۰ پر لکھتا ہے:

"اسلام کے بارے میں تحقیق کرنے والوں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ اسلام میں ایک خاص قسم کا معاشرہ اُبھرتا ہے۔ اور یہ بات بڑی واضح ہے کہ اسلامی معاشرہ نمایاں طور پر باہم پیوستہ ہے۔ اس معاشرے کے ارکان کی ایک دُوسرے سے محبت اور ربط وتعلق بہت ہی اہم اور قابلِ قدر ہے اور بہت سے لوگوں نے یہ نکتہ سمجھ لیا ہے کہ اسلامی جماعت محض ایک معاشرتی مجموعہ نہیں ہے بلکہ دینی مجموعہ ہے یا اگر ہم اپنی غیر مناسب مغربی تعبیر استعمال کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس معاشرے میں دین اور حکومت ایک ہی چیز ہے! اسلامی معاشرہ دُوسرے معاشروں کی مانند صرف دوستیوں اور رسم ورواج کے مجموعے یا عقائد و اقدار کے ایک سنجیدہ نظام کے ذریعہ باہم مربوط نہیں ہوتا اور نہ وہ محض کسی بلند مثالی نظریہ کا نتیجہ ہوتا ہے بلکہ اسلامی معاشرہ افراد کے گہرے ایمان ویقین سے اُبھرنے والی زندگی سے متحرک رہتا ہے اور ایمان ویقین کی حرارت سے اس معاشرے کا ہر فرد سرشار ہوتا ہے اور اگر ہم دین کو انفرادی مذہب کے معنی میں استعمال کریں (جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے) تو

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ معاشرہ یا جماعت ہی مذہب کے ارفع و اعلیٰ مثالی نظریہ کی تعبیر و تفسیر ہے۔ اور جس طرح کوئی عقیدہ یا مذہبی نظام شخصی اعتقاد کی صورت میں عقلی تعبیر بن سکتا ہے (جیسا کہ اکثر حالات میں ہوتا ہے بالخصوص مسیحیت میں) تو وہ اجتماعی نظام جو زندگی کے مختلف انداز و اطوار پر مشتمل ہوتا ہے وہ عملی صورت میں ایک مسلمان کے شخصی اعتقاد کی تعبیر ہے۔"

اس سلسلے میں مستشرقین کے مزید اقتباسات کے حوالوں کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ تمام مستشرقین نے اسلام کے مفہوم اور اسلامی تاریخ کے اس امتیازِ خصوصی کو واضح طور پر تسلیم کیا ہے کہ اسلامی معاشرہ اسلام کے عقیدے سے پھُوٹتا ہے اور اسی عقیدہ کی بنیاد پر قائم رہتا ہے اور اسلامی معاشرے کو عقیدے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ عقیدہ ہر فرد کے اس عملی سلوک میں نمایاں نظر آتا ہے جس کے احکام ہر فرد اسلام کے اس جامع قانون سے حاصل کرتا ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ دورِ اول کے مسلمانوں کے نزدیک جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اسلام کے مفہوم کی یہ ایک واضح حقیقت تھی کہ نہ تو اسلامی معاشرہ قائم ہوئے بغیر اسلام کا کوئی وجود ہے اور نہ جب تک اسلامی شریعت کے مطابق معاشرہ قائم کرنے اور پھر اس معاشرہ کے شریعت سے انحراف کو روکنے کے لیے ہر مسلمان جدوجہد کرے' اسلام کا وجود ہو سکتا ہے۔

اس حقیقت کو پا لینے کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ لوگ اسلامی قانون کو رُوئے زمین پر موجود انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط سمجھتے تھے۔ انھوں نے کبھی اس انداز سے نہیں سوچا تھا کہ اسلامی شریعت صرف عبادات تک یا صرف نکاح، طلاق، عتاق اور وراثت کے شخصی اور ذاتی مسائل تک محدود ہے بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ اسلامی شریعت ایسے تمام معاملات کا احاطہ کر لیتی ہے جو کسی بھی اسلامی معاشرے میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ جب تک یہ معاشرہ اسلام کے مطابق رہے یعنی جب تک اس معاشرے کو دنیا میں براہِ راست اسلامی معاشرے کی تفسیر یا اسلامی فکر سے پیدا ہونے والا معاشرہ کہا جا سکے۔

خرید و فروخت، ملکیت، گروی رکھنے یا کرایہ پر لینے دینے اور قرض کے مسائل بلکہ وہ تمام تمدنی و اقتصادی مسائل جو دو افراد کے درمیان یا فرد اور معاشرے کے مابین یا فرد اور حکومت کے درمیان پیدا ہو سکتے ہیں، ان سب مسائل کے لیے اسلام قانون بناتا ہے اور سب معاملات اسی قانون کی روشنی میں طے پاتے ہیں چنانچہ اسلام بیع کو حلال قرار دیتا ہے اور سود، ذخیرہ اندوزی، اجارہ داری، لوٹ کھسوٹ، ملاوٹ، فریب اور ظلم کو حرام قرار دیتا ہے۔ اسی طرح دولت کے سرمایہ داروں کے ہاتھ میں سمٹ جانے اور باقی افرادِ معاشرہ کے محروم رہ جانے کو حرام قرار دیتا ہے اسی طرح اسلام حکم دیتا ہے کہ حکومت زکوٰۃ وصول کرکے اسے قرآن کے مقرر کردہ مصارف میں خرچ کرے اور بیت المال کی آمدنی کے ذرائع متعین کرکے لوگوں میں مال تقسیم کرنے کے قواعد مرتب کرے اور اس طرح کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں معاشرتی انصاف کے قواعد و ضوابط بنا کر ان کی پابندی کرے تاکہ وہ حکومت اسلامی حکومت کہلا سکے۔ اسی طرح حکمرانی کی سیاست کے اصولوں اور فرد و حکومت کے ایک دوسرے سے تعلقات کی تحدید و تعیین اور تدوین و ترتیب قرآن و سنت کے احکام اور ان احکام کی روح کے مطابق اور پھر ان ہی کی روشنی میں منعقد ہونے والے اجماعِ اُمت کے ذریعہ کی گئی ہے۔

چنانچہ شوریٰ کا بنیادی اصول طے پایا اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی اطاعت اور حاکموں کی اطاعت جب تک وہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرتے رہیں واجب قرار دے دی گئی جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے واضح الفاظ میں اس کی حدود بیان فرمائی ہیں: اَطِیْعُوْنِیْ مَا اَطَعْتُ اللّٰہَ فِیْکُمْ فَاِنْ عَصَیْتُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَلَا طَاعَۃَ لِیْ عَلَیْکُمْ۔ جب تک میں تمہارے معاملات کے سلسلے میں احکامِ الٰہی کی اطاعت کرتا رہوں تم بھی میری اطاعت کرتے

رہو۔ اور اگر میں اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث مبارک سے ماخوذ ہے لَا طَاعَۃَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ۔ (یہ حدیث امام احمد اور حاکم رحمہم اللہ نے روایت کی ہے) مخلوق (غیر اللہ) کے جس حکم سے خالق کی نافرمانی ہوتی ہو اس حکم کی اطاعت جائز نہیں۔

اسلامی شریعت میں فوجداری قانون کے لیے بھی واضح اور جامع احکام موجود ہیں جن کو اسلامی معاشرہ قتل، زنا، چوری، شراب نوشی، ارتداد اور فساد فی الارض (رہزنی اور بغاوت) کے جرائم کی سزاؤں میں بطورِ حد اور ان سزاؤں میں جو بطور تعزیر دی جاتی ہیں نافذ کرتا ہے۔ ان سب سزاؤں کے سلسلے میں بھی سنتِ نبویؐ کی نظری اور عملی وضاحتوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ مثلاً اِدْرَءُوا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُہَاتِ۔ "اگر شبہ واقع ہو جائے تو سزاؤں کو ساقط کر دیا جائے"۔ نیز جرم کا ارتکاب کرنے والے فرد کو سزا کے نفاذ کے بعد اگر وہ توبہ کرلے اور جرم سے کنارہ کش ہونے کا اعلان کردے تو معاشرے میں دوبارہ عمل کے مواقع مہیا کر دیے جاتے ہیں نہ ارتکابِ جرم کی وجہ سے اسے شرمندہ کیا جاتا ہے اور نہ اس پر پاکیزہ زندگی گزارنے کی راہیں بند کی جاتی ہیں[1]۔

اسلامی شریعت معاشرتی رسم و رواج، مجلسی آداب اور صنفی آداب کی حدود بھی مقرر کرتی ہے چنانچہ واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ سلامتی، اخوت، تعاون اور نیکی اللہ سے رابطہ رکھنے والے معاشرے کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اسی طرح اسلامی معاشرے میں مرد و عورت کے جسمانی و روحانی تعلقات کی حدود اور ان کی نوعیت و کیفیت بھی بہت

۱۔ اسلامی سزاؤں کی کیفیت اور ان سزاؤں کے ہر زمانے میں "انسانیت کیلئے مناسب ہونے اور ان میں ہمیشہ عدلِ مطلق کے اصول کو ملحوظ رکھے جانے کے سلسلے میں ہماری کتاب "الانسان بین المادیۃ والاسلام" کا باب جرم و سزا اور ہماری کتاب "قبسات من الرسول" کا باب "ادرأ الحدود بالشبہات" دیکھیے۔ (مصنف)

واسع انداز میں بتا دی گئی ہے۔ مثلاً عورت کیسا لباس پہنے کیا نہ پہنے، اپنے جسم کے کس حصے کو ظاہر کر سکتی ہے اور کس قدر حصہ چھپانا ضروری ہے۔ اسلام نے جو صنفی آداب بتائے ہیں ان کی وجہ سے معاشرے کی پاکیزگی بھی محفوظ رہتی ہے، فطرتِ سلیمہ کے مطابق بھی ہیں اور ان سے صحیح اور استوار زندگی کے تقاضے بھی تسکین پاتے ہیں۔

اور اس طرح اسلامی شریعت زندگی کے تمام مسائل و معاملات کا احاطہ کر لیتی ہے۔

قرنِ اول کے مسلمان یہ بات خوب سمجھتے تھے کہ زندگی کے لیے قانون کا اصل منبع و ماخذ صرف اللہ کی شریعت ہے اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ نیز یہ کہ اس زمین پر انسانی زندگی کو منظم و مرتب کرنے کے لیے اس قانون کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ممکن ہی نہیں ہے۔

دراصل اللہ پر پختہ ایمان کا تقاضا بھی یہی ہے ورنہ دل کی گہرائی میں اترے ہوئے پکے اور سچے ایمان کے کیا معنی ہوں گے اگر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تصدیق نہ کی جائے جو اس نے اپنی کتاب میں بیان فرمایا ہے اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے یہ قانون خود انسانوں کے فائدے اور بھلائی کے لیے بنایا ہے اور اسی لیے اس قانون کا نفاذ ضروری قرار دیا ہے اور اسی بنا پر جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے قانون کو عملاً نافذ نہیں کرتے وہ کافر، ظالم اور فاسق ہیں۔

اور اس سچے اور پکے ایمان کا کیا فائدہ ہوگا اگر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تصدیق نہ کی جائے کہ قانونِ الٰہی کے سوا ہر قانون انسانوں کے کسی حق سے منحرف طبقہ کی خواہشاتِ نفس کے تابع ہوتا ہے۔ اور صرف اللہ کا قانون ہی حق ہے کیونکہ وہ اُس ذاتِ برحق کا نازل فرمودہ ہے جو نہ ظالم ہے اور نہ ہوائے نفس کے تابع۔ اسی طرح اللہ پر پکے اور سچے ایمان کے کیا معنیٰ ہوں گے اگر مسلمان کے دل میں یہ خیال بھی ہو کہ اللہ کا علم محدود ہے

۱۔ مسئلہ جنس کے بارے میں اسلامی نقطۂ نگاہ اور اس مسئلہ کا اسلامی حل معلوم کرنے کیلئے ہماری کتاب "الانسان بین المادیۃ والاسلام" کا باب "مسئلہ جنس" اور ہماری کتاب "معرکۃ التقالید" کا مطالعہ کیجئے۔ (مصنف)

اور انسانی علم و تجربہ اللہ کے علم سے افضل، زیادہ سچا اور قابلِ اتباع ہے بعینہٖ اس سچے اور پختہ ایمان کا کیا مفہوم ہوگا اگر مسلمان کے دل میں یہ خیال بھی آتا رہے کہ اسلام کا یہ مفصل قانون جو اس کائنات کی فطرت اور قوانینِ وجود سے ہم آہنگ ہے۔ یہ صرف جزیرہ نمائے عرب کے ایک مختصر گروہ اور ان کی زندگی کے محدود عرصہ کے لیے تھا اور اتنی ہی مدت نافذ رہا جب تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان موجود رہے حالانکہ قرآن حکیم اس قانون کے متعلق کہتا ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لیے ہے: اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (ص ۸۷) "یہ تو ایک نصیحت ہے تمام جہان والوں کے لیے"۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (الفرقان ۱)

"نہایت متبرک ہے وہ جس نے یہ فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لیے نذیر ہو"۔ نیز قرآن کہتا ہے کہ اس کتاب میں جو قانون انسانوں کے لیے نازل کیا گیا ہے وہی حق ہے: وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ (الاسراء ۱۰۵) "اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ نازل ہوا ہے"۔ اور یہ وہ "حق" ہے جو اس عظیم کائنات کے قانونِ تخلیق سے ہم آہنگ ہے: وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ (الجاثیہ ۲۲) "اللہ نے تو آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور اس لیے پیدا کیا ہے کہ ہر متنفس کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے، لوگوں پر ظلم ہرگز نہیں کیا جائے گا"۔ گویا شریعتِ حقہ ہی وہ قانون ہے جس کے اقتضا پر ہر نفس کو اس کے کیے کا بدلہ ملتا ہے اور یہی وہ حق ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا ہے۔ یہ حق محض جزیرہ نمائے عرب کے محدود علاقہ کا جزوی "حق" نہیں ہے اور نہ صرف اس مختصر مدت کا وقتی "حق" ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے درمیان گزاری تھی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی سب سے آخر نازل ہونے والی آیات میں سے ایک آیت

میں تمام انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے : اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ (مائدہ ۳) "آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے ۔ اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے ۔" اللہ پر پختہ ایمان کا کوئی مفہوم نہیں رہ جاتا اگر مسلمان کے دل میں مندرجہ بالا باتوں میں سے کسی ایک بات کا خیال بھی آئے یا وہ اس حق میں شک کرے جس حق کا یہ دین اپنے تمام قوانین و توجیہات میں حامل ہے ۔ یہ خیالات دراصل ایمان کی حقیقت سے متناقض ہیں کوئی صحیح الفکر مسلمان ایسی جرأت نہیں کر سکتا ۔

شریعتِ اسلامیہ کو نازل ہوئے چودہ صدیاں گزر چکی ہیں اور اس اثنا میں رُوئے زمین کے مختلف خطوں میں انسانیت بہت سے تجربات سے آشنا ہو چکی ہے انسانوں نے فلسفہ دریافت کیا ، مختلف علوم میں مہارت حاصل کی اور علوم سیاست کا مطالعہ کیا ۔ لیکن اس تمام ارتقاء کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہلِ زمین کا بنایا ہوا ہر قانون برسرِ اقتدار گروہ کی خواہشات کا آئینہ دار ہوتا رہا اور اس کے ذریعہ دوسرے طبقوں کی مصلحتیں قربان کر کے مقتدر طبقہ کے اغراض و مصالح کی تکمیل کی جاتی رہی ۔ مثلاً اگر جاگیردارانہ نظام آتا ہے تو وہ دوسرے طبقوں کی مصلحتیں نظرانداز کر کے صرف جاگیردارانہ طرز کا اور جاگیرداروں کے فائدے کا قانون بناتا ہے اور اگر سرمایہ دارانہ نظام برسرِ اقتدار آ جاتا ہے تو وہ مزدوروں کو نظرانداز کر کے سرمایہ داروں کے اغراض و مقاصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے سرمایہ دارانہ قانون بناتا ہے اور اگر مزدور کی آمریت قائم ہو جاتی ہے تو وہ بھی کم از کم نظری طور پر ایسا قانون بناتی ہے جس میں دوسرے انسانوں کے مصالح سے قطع نظر مزدوروں کے فوائد پیشِ نظر رکھے گئے ہوتے ہیں ۔ کم از کم تاریخ میں آج تک یہی ہوا ہے ۔

یہی وہ حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایک اصول کے طور پر بیان

فرمائی ہے کہ غیر اللہ کا بنایا ہوا ہر قانون "ھویٰ" یعنی ان کی خواہشِ نفس کا آئینہ دار ہوتا ہے اور جدھر وہ مڑتے ہیں قانون بھی وہی رُخ اختیار کر لیتا ہے ۔

شریعتِ اسلامیہ کو نازل ہوئے چودہ صدیاں گزر چکی ہیں اور اس اثنا میں انسانیت اکنافِ عالم میں متعدد تجربات سے دوچار ہو چکی ہے ۔ یہ تجربات خود اس بات کے گواہ ہیں کہ جب اور جس جگہ انسان اللہ کے قانون سے منحرف ہوا ہے اس کا نتیجہ ناقابلِ برداشت تلخیوں اور بدبختیوں کی صورت میں نکلا ہے جس کی وجہ سے انسانوں کا امن و چین برباد ہو گیا اور وہ مختلف گروہوں میں بٹ کر ایک دُوسرے کی ایذارسانی کے درپے ہو گئے ۔ اور اسی کا نتیجہ تاریخِ جدید کی وہ عالمگیر بدبختی تھا جس کی وجہ سے صرف چوتھائی صدی میں دو عالمی لڑائیاں لڑی جا چکی ہیں اور تیسری جنگ تاریخ کی ہولناک ترین تباہ کاریاں اپنے جلو میں لیے انسانیت کے دروازے پر دستک دے رہی ہے اور اسی کے نتیجہ میں خاندانی زندگی ختم ہو گئی ۔ اخلاق باختگی عام ہو گئی اور نظریاتی تضادات کا شکار ہو کر فرد کے اعصاب اس بُری طرح کچلے گئے کہ دماغی امراض ، نفسیاتی اور اعصابی اضمحلال کے عارضے ، فشارُ الدم اور خودکشی کے حادثے جس قدر اس دور میں ہو رہے ہیں انسانی تاریخ کے تمام اَدوار میں مجموعی طور پر اتنی تعداد میں نہیں ہوئے ۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمان باوجودیکہ وہ ہماری طرح فلسفی نہ تھے اس حقیقت سے باخبر تھے کہ انسانی مزاج میں دو طرح کے عناصر ہیں ۔ ایک مستقل (ایک ہی حالت پر قائم رہنے والا) اور دُوسرا متغیر (مسلسل بدلتے رہنے والا) اگرچہ اس تخلیقی مرکب (وجودِ انسانی) میں یہ دونوں عناصر ایک دوسرے کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہو گئے ہیں اور انھیں یہ بات بھی معلوم تھی کہ انسانیت کے لیے اللہ کا مقرر کردہ ابدی قانون انسانی تاریخ کے تمام اَدوار میں انسانی مزاج کے ان دونوں (متغیر اور غیر متغیر) عناصر کی کفالت کرتا رہا ہے اور اسی نے دین اور اللہ پر اعتقادِ محکم کے رشتہ سے ان دونوں عناصر کو ایک دُوسرے سے باہم مربُوط رکھا ہے ۔

انسانی تکوین کا غیر متغیر عنصر ان ازلی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہے جو انسان کی تخلیق میں شامل ہیں اور احوال وظروف کی تبدیلی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ کہ انسان کی تخلیق اللہ کی مشیت کا تقاضا ہے: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (البقرہ ۳۰) "پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

یا یہ کہ تمام انسان ایک ہی نفس سے پیدا ہوئے ہیں: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (النساء۔ ۱) "لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔"

یا یہ کہ اسی ایک نفس سے یعنی اسی کی جنس سے اللہ تعالیٰ نے اس کا جوڑا پیدا کیا ہے جس کے ساتھ وہ مل کر رہتا ہے اور جو اس کا ہمزاد ہے۔ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (النساء۔ ۱) "تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا۔" وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (الروم ۲۱) "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے، کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔" اور یہ کہ اسی نفس اور اس کے جوڑے سے تمام مخلوق پیدا ہوئی: خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (النساء۔ ۱) "جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے۔"

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ (الحجرات ۱۳) "لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے پرہیزگار ہے۔"

مذکورہ بالا ازلی اور ابدی حقیقتوں کی بنیاد پر چند اور حقیقتیں وجود میں آتی ہیں اور وہ بھی ان ہی کی مانند ازلی اور ابدی ہیں۔ مثلاً ایک یہ حقیقت مترتب ہوتی ہے کہ مخلوق فطری طور پر جب تک ان کی فطرتِ سلیم ہے اپنی حقیر ہستی کے بالمقابل ذاتِ باری تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا احساس رہنا چاہیے تاکہ اسی کی عبادت کریں اور اسی سے کاروبارِ حیات میں مدد و استعانت طلب کریں۔

انہی حقائقِ ازلیہ سے یہ حقیقت بھی پیدا ہوتی ہے کہ زوجین جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایک ہی نفس سے پیدا فرمایا ہے۔ یگانگت محسوس کریں اور ایک دوسرے کے ساتھ شفقت سے رہیں اور یہ بات سمجھیں کہ ان کا وجود اسی صورت میں مکمل ہو سکتا ہے جب وہ محبت اور مہربانی سے ایک ہو کر زندگی گزاریں۔ ان ہی کی بنا پر یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ بنی نوع انسان کو جب تک ان کے دل صاف اور نفوس پاکیزہ ہوں انسانی اخوت کا احساس رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ ایک ہی نفس سے پیدا ہوئے ہیں اور آپس میں رشتہ دار ہیں۔ اسی بنا پر انہیں ایک دوسرے سے نیک کاموں میں تعاون و اشتراک کرنا چاہیے۔ یہ حقیقتیں غیر متبدل ہیں کیونکہ یہ ابدی بنیادوں پر قائم و مرتکز ہیں۔

لیکن ان کے ساتھ ہی کچھ اور حقائق بھی ہیں جو تغیر پذیر ہیں۔ اور ان میں تغیر و تبدل اس وجہ سے واقع ہوتا رہتا ہے کہ انسانی علوم میں ارتقاء ہو رہا ہے اور عقلِ انسانی اور کائنات کے درمیان تعامل و تفاعل کا سلسلہ جاری ہے۔ عقل چاہتی ہے کہ اس کائنات کے تمام اسرار و رموز سے واقف ہو جائے، اس کی حقیقت کو جان لے، اس کے خزانے برآمد کر لے اور پوری کائنات کو اپنے فائدے کے لیے مسخر

کرلے۔ اور اس کے نتیجے میں زندگی کی نئی قدریں اور نئے نئے اوضاع و اطوار پیدا ہو رہے ہیں لوگ بدوی زندگی سے شہری مُہذب زندگی کی طرف منتقل ہو رہے ہیں، زراعت سے صنعت کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور صنعت سے مزید آگے کی طرف۔

اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لیے یہ انسانیت کے ان دونوں پہلوؤں میں فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ چنانچہ اسلام نے انسانیت کے غیر متغیر پہلو کے لیے غیر متغیر قوانین بنائے ہیں اور متغیر پہلو کے لیے چند مستقل بنیادیں فراہم کرنے کے بعد ان بنیادوں کے اندر رہتے ہوئے مسلسل ارتقاء کی راہیں کھُلی چھوڑ دی ہیں تاکہ دونوں صورتوں میں یہ قانونِ فطرتِ کائنات اور فطرتِ حیات سے ہم آہنگ رہ سکے۔

انسانیت کے غیر متغیر پہلو میں اسلام عقیدہ عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ پر ایمان ایک ناقابلِ تغیر اکائی ہے اس لیے کہ یہ ناقابلِ تغیر بنیاد پر اُستوار ہے اور عقیدے کے پہلو بہ پہلو اسلام نکاح و طلاق کے قوانین، حُدود اور تمدنی اور حکومتی آئین بھی عطا کرتا ہے چونکہ نکاح و طلاق یعنی مرد و زن کے تعلقات غیر متغیر عنصر ہے اس کے لیے مستقل اور غیر متغیر قوانین موجود ہیں اس لیے کہ یہ تعلقات جن بنیادوں پر قائم ہیں، وہ بھی غیر متغیر ہیں یعنی (۱) مرد (۲) عورت (۳) اور وہ گہرا تعلق جو دونوں کو ایک دوسرے کی طرف جذب کرنے اور دونوں کے باہم بندھے رہنے کا باعث ہے۔

زندگی کے حالات و ظروف تغیر پذیر ہیں۔ معاشرے میں بھی تغیر واقع ہوتا رہتا ہے اور معیشت، نظامِ تعلیم اور نظمِ سیاست بھی بدلتا رہتا ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز اس مستقل حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتی جس کو فطرت نے انسان کی فزیالوجی، بیالوجی، غدودوں اور کیمیاوی اجزاء کی وجہ سے استحکام بخش رکھا ہے اور وہ یہ کہ مرد مرد ہے اور عورت عورت اور دونوں ایک دُوسرے سے مستغنی اور

علیحدہ نہیں رہ سکتے۔[1]

اسی طرح حدود یعنی مخصوص جرائم کی وہ سزائیں جن کا نفاذ جُرم ثابت ہو جانے کے بعد فرض ہے۔ یہ ایک ایسا عنصر ہے جس میں تغیر واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کی بنیاد بھی غیر متغیر ہے اور وہ ہے انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی تعلقات اور احترامِ آدمیت کا اصول جس کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی کسی پر دست درازی نہ کرے۔

زندگی کے حالات تغیر پذیر ہیں۔ عمل کے روابط اور پیداواری وسائل بھی بدلتے رہتے ہیں اور انسانوں کے مشینوں سے تعلقات اور سیاسی نظام بھی تغیر پذیر رہتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی اس غیر متبدل حقیقت کو نہیں بدل سکتی جسے انسانی تاریخ نے ثابت کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ سب انسان ایک نفس سے پیدا ہوئے ہیں اور رحم کا تعلق سب کو باہم مربوط کیے ہوئے ہے۔[2]

---

[1] ہم نے اپنی کتاب شبہات حول الاسلام کے باب "اسلام اور عورت" میں مرد و عورت کے باہمی تعلقات اور اسلام میں ان کی نوعیت پر مفصل بحث کی ہے۔ ہم نے اس میں بتایا ہے کہ اسلام نے اس مسئلہ کو کس انداز میں مکمل عدل سے حل کیا ہے اور یہ کہ ارتقاء نہ تو اس عادلانہ حل سے متصادم ہے اور نہ اس میں کچھ اضافہ کر سکتا ہے لیکن اگر ارتقاء سے اخلاقی فساد اور مرد و زن کے درمیان میکانکی مساوات مراد لی جائے تو اس کے لیے یورپ میں اپنے کچھ مقامی حالات اور تقاضے ہیں جن کا انسان کی حقیقی اقدار سے کوئی تعلق نہیں۔

[2] اشتراکی کہتے ہیں کہ ان رشتوں کا درحقیقت کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ صرف وہاں پائے جاتے ہیں جہاں انفرادی ملکیت موجود ہے۔ اگر انفرادی ملکیت ختم کر دی جائے تو وہ تمام قانونی شقیں جو ان تعلقات کی بنیاد پر بنی ہیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ اور یہ بات درست بھی ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ خود اشتراکیت انفرادی ملکیت کو از سرِ نو شروع کر رہی اور جو کسر رہ گئی ہے وہ عنقریب پوری ہو جائے گی۔ مصنف

اسی طرح بعض تمدنی مسائل بھی غیر متغیر نوعیت کے ہیں۔ مثلاً بیع، اجارہ، رہن، قرض وکالت وغیرہ چنانچہ ان تمام امور کے لیے جو قوانین ہیں وہ بھی غیر متغیر ہیں۔ اسی طرح جنگ و صلح کے زمانے میں حکومتوں کے تعلقات کے بارے میں قوانین مستقل نوعیت کے ہیں۔

باقی رہ گئے انسانی زندگی کے وہ تغیر پذیر پہلو جو اپنی تغیر پذیری کے باوصف زندگی کے غیر متغیر پہلو سے پیوستہ ہیں۔ مثلاً حکومتی اور مالی سیاست اور معاشرے اور ماحول کی متنوع شکلیں، مثلاً بدویت، زراعت، تجارت اور صنعت وغیرہ تو یہ سب ایسے امور ہیں جو عقلی ارتقاء اور عقل اور کائنات کے باہمی تعامل کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ مگر اس تغیر کے باوجود اپنی غیر متغیر بنیاد سے جدا نہیں ہوتے اور جدا ہونا ممکن بھی نہیں کیونکہ خود انسان ایک مربوط وحدت ہے جس کا تجزیہ ممکن نہیں ہے۔

ان مسائل و معاملات میں اسلام کا طریق کار بہت ہی حکیمانہ اور فطرت کے مطابق ہے۔ چنانچہ اسلام نے ان امور کے لیے رہنما اصولوں کی نشان دہی تو کر دی ہے لیکن جزوی تفصیلات وضع نہیں کیں۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ ارتقاء کا ایک فریم بنا دیا ہے جس کے اندر رہتے ہوئے انسانیت جس قدر چاہے ترقی کر لے۔ اور یہ امر آنے والی نسلوں پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے مزاج، اپنے مادی حالات، اپنے علم اور اپنے ذرائع پیداوار کے مناسب و مطابق کوئی خاص شکل وضع کر لیں بشرطیکہ یہ شکل اسلام کے مقرر کردہ فریم سے بڑی نہ ہو کہ فریم میں سما نہ سکے اور نہ چھوٹی ہو کہ خلا باقی رہے۔ جہانبانی کی سیاست میں اسلام نے دو اصول طے کر دیے ہیں۔ (۱) عدل (۲) شوریٰ۔ وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ۔ (النساء ۵۸) "جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔" وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (شوریٰ ۳۸) "اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں۔" لیکن شوریٰ کا کوئی خاص طریقہ متعین نہیں کیا، کہ ایک ایوانی ہو یا دو ایوانی۔ شوریٰ کے ممبر منتخب ہوں یا نامزد۔ نمائندگی شخصی ہو یا

پیشہ ورانہ وغیرہ وغیرہ۔ غرض ان تمام معاملات میں فیصلہ انسانی تجربے اور اپنے حالات کے مطابق تطبیق و اطلاق پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

مالی امور میں چند بنیادی اصولوں کا ضابطہ قوانین وضع کر دیا ہے جن میں ایک قدر مشترک ہے کہ سب لوگ دولت میں شریک ہوں اور کوئی محروم نہ رہے۔ قرآن مجید نے اصول بنا دیا ہے کہ تمام دولت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے اور اسی نے جماعت کو عطا فرمائی ہے۔ اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ (الحدید ۷) "ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو ان چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔" وَاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ (النور ۳۳) "اور ان کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمھیں دیا ہے۔" قرآن نے قرار دیا ہے کہ دولت کی اولین حق دار جماعت ہے اور فرد کارکن کی حیثیت سے اپنی حسن کارکردگی کے مطابق مال کا حق دار بنتا ہے۔ اگر وہ اچھی کارگزاری کا ثبوت نہ دے تو دولت پھر جماعت کی طرف جو اس کی اولین حق دار ہے لوٹ جائے گی: وَلَا تُؤْتُوا السُّفَھَآءَ اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰہُ لَکُمْ قِیٰمًا (النساء ۵) "اور اپنے وہ مال جنھیں اللہ نے تمھارے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو۔" نیز قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات ناپسندیدہ ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں گردش کرتی رہے۔ اور اجتماعی طور پر قوم اس سے محروم رہے: کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (الحشر ۷) "تاکہ وہ (مال) تمھارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔" دولت پر غریبوں کے طے شدہ حق کے طور پر زکوٰۃ فرض کی گئی ہے جو حکومت وصول کر کے مستحق افراد میں تقسیم کرتی ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْھَا۔ (توبہ ۶۰) "یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں۔"

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: اَلنَّاسُ شُرَکَاءُ فِی ثَلَاثٍ. اَلْمَاءِ وَالْکَلَاءِ. وَالنَّارِ (مصابیح السنہ) تین چیزوں میں سب لوگ برابر کے شریک ہیں۔ پانی، گھاس، اور آگ۔ نیز آپ نے ارشاد فرمایا: لَاَنْ یَّمْنَحَ اَحَدُکُمْ اَخَاہُ (اَرْضَہٗ) خَیْرٌ لَّہٗ مِنْ اَنْ یَّاْخُذَ خَرْجًا مَّعْلُوْمًا (بخاری) تم میں سے جو شخص اپنی زمین اپنے کسی بھائی کو بلا معاوضہ دے دے یہ اس سے بہتر ہے کہ اس سے مقرر کردہ رقم وصول کرے۔ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔ اگر بعد میں آنے والے مسلمانوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ہر مفتوحہ گاؤں اس کے باشندوں میں اس طرح تقسیم کر دیتا جس طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر تقسیم کر دیا تھا۔ (بخاری)۔

پھر اسلام نے مال میں جو حق جماعت کو دیا ہے اس میں لوگوں کے اشتراک کا کوئی مخصوص طریقہ متعین نہیں کیا کہ رفاہِ عام کی چیزیں افراد کا ملک بنانے کی بجائے شاملات قرار دے دی جائیں۔ یا کارکنوں کو اصل سرمایہ میں حصہ دار بنایا جائے یا ان کو اس قدر اُجرت دی جائے کہ ان کی وہ بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں جو آپ نے اپنے اس ارشادِ گرامی میں بیان فرمائی ہیں: مَنْ وَلِیَ لَنَا عَمَلًا وَلَیْسَ لَہٗ مَنْزِلٌ فَلْیَتَّخِذْ مَنْزِلًا اَوْ لَیْسَتْ لَہٗ زَوْجَۃٌ فَلْیَتَّخِذْ زَوْجَۃً اَوْ لَیْسَ لَہٗ خَادِمٌ فَلْیَتَّخِذْ خَادِمًا اَوْ لَیْسَتْ لَہٗ دَابَّۃٌ فَلْیَتَّخِذْ دَابَّۃً (احمد و ابو داؤد) جو ہمارے کسی کام کی ذمہ داری قبول کرے اور اس کے پاس اگر مکان نہ ہو تو مکان لے سکتا ہے۔ اگر بیوی نہ ہو تو اسے شادی کرنے کی سہولت مہیا کی جائے۔ اگر اس کے پاس نوکر نہ ہو تو اسے نوکر دیا جائے۔ اور اگر سواری نہ ہو تو سواری دی جائے۔

گویا سیاسی اور مالی امور میں اسلام نے کوئی مخصوص صورت متعین نہیں فرمائی اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے یہ اختیار باقی رہنے دیا ہے کہ وہ اپنے حالات اور امکانات کے مطابق و مناسب کوئی سی صورت انتخاب کر لیں اسی لیے اسلام نے ان معاملات کی

جامد اور ناقابلِ تبدل تفصیلات نہیں وضع کیں تاکہ یہ تفصیلات معاشرے کے ارتقاء اور مسلسل جاری رہنے والے عملِ تغیر سے متصادم نہ ہوں۔ بایں ہمہ اسلام نے یہ اجازت بھی نہیں دی کہ یہ امور بنیادی غیر متغیر اصولوں کی حدود سے آزاد ہو جائیں اور یہ گنجائش نہیں چھوڑی کہ لوگ بلا دلیل یہ کہہ کر کہ وہ اپنے دنیوی امور کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں، بنیادی اصولوں کو بھی بدل ڈالیں۔

یورپ میں اسلام کی مقرر کردہ عمومی حدود سے ہٹ کر آزادانہ تصرف کا نتیجہ ایسی بھیانک تباہی کی صورت میں برآمد ہوا ہے جس کی وجہ سے ارتقاء پذیر انسانیت کی پیشانی شرم سے عرق آلود ہے۔ یورپ میں پہلے جاگیردارانہ نظام تھا۔ پھر سرمایہ دارانہ نظام آیا اور دونوں نظاموں میں جتنے مظالم ہوئے کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے دونوں نظام ناجائز ہیں۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں مال (دولت ہو یا زمین) صرف امیروں کے ہاتھ میں گردش کرتا رہتا ہے اور باقی لوگ محروم رہتے ہیں۔ پھر ان دونوں نظاموں سے نجات دلانے کی دعوے دار اشتراکیت آئی جو ہیئتِ مقتدرہ کی مطلق غلامی اور افراد پر مسلط آزاد آمریت کا نام ہے۔

اسلام جو رُوئے زمین کے سب انسانوں اور انسان کی سب نسلوں کے لیے اللہ کا پیغام ہے اس میں ایسے ارتقاء کی گنجائش نہیں ہے جس کی وجہ سے لوگ بیڑیوں میں جکڑ کر رہ جائیں۔ اسلام اگرچہ ہر قسم کی نشو و نما اور مناسب حال تمام اوضاع و اطوار اپنانے کی اجازت دیتا ہے لیکن ہر قدم پر انسانوں کی دست گیری و رہنمائی بھی کرتا ہے تاکہ راہِ راست سے بھٹک نہ جائیں اور ہر صورت میں اور ہر حالت میں اپنی وجدانی آزادی محفوظ رکھیں۔

قرونِ اُولیٰ کے مسلمان، اگرچہ انھوں نے مسائل کو ہماری طرح فلسفہ نہیں بنایا تھا، ان تمام امور سے واقف تھے چنانچہ مستقل حیثیت کے امور میں ان کی فقہی کاوشیں نصوص کی تشریح اور ان حالات کے بیان تک محدود تھیں جن میں

نص کے احکام نافذ ہو سکتے ہیں اور بدلتے رہنے والے امور میں ان کی فقہ کی حد اصولوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ حضرت عمر ابن عبد العزیز کا یہ قول تھا: "جس قدر مسائل پیدا ہوتے جائیں گے ان کے احکام (حل) بھی سامنے آتے جائیں گے۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اسلام کے مفہوم میں یہ بات پالی تھی کہ دنیا و آخرت ایک وحدت ہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: اِنْ قَامَتِ السَّاعَۃُ وَبِیَدِ اَحَدِکُمْ فَسِیْلَۃٌ فَاسْتَطَاعَ اَنْ لَّا تَقُوْمَ حَتّٰی یَغْرِسَہَا فَلْیَغْرِسْہَا فَلَہٗ بِذَالِکَ اَجْرٌ۔ اگر قیامت آجائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں پودے کی قلم ہو اور اسے اتنا وقت مل جائے کہ اسے زمین میں لگا سکے۔ تو اسے ضرور لگا دے۔ اس لیے کہ اس کا بھی اسے اجر ملے گا۔" (علی بن العزیز نے "منتخب" میں یہ حدیث سند حسن سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے)۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے وہ فکرِ اسلامی کا یہی عجیب امتیاز خصوصی ہے کہ دنیا کا راستہ ہی بعینہٖ آخرت کا راستہ ہے۔ ان دونوں راستوں میں کوئی فرق و اختلاف نہیں ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ یہ دو جدا جدا راستے ہیں ایک دنیا کا اور دوسرا آخرت کا۔ بلکہ ایک ہی راستہ ہے جو دونوں منزلوں تک پہنچاتا اور دونوں کو ملاتا ہے۔ اسلام میں ایسا نہیں ہے کہ ایک راستہ آخرت کا ہے اور اس کا نام عبادت ہے اور دوسرا راستہ دنیا کا ہے اور اس کا نام عمل ہے بلکہ صرف ایک ہی راستہ ہے جس کی ابتدا دنیا سے ہوتی ہے اور انتہا آخرت میں۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جس میں عمل عبادت ہے، اور عبادت عمل سے جدا نہیں ہے۔ اسلام کی نظر میں دونوں ایک ہی شے ہیں، دونوں مل جل کر اس واحد راستے میں پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ یہاں عمر کے آخری لمحے اور زندگی کے آخری قدم تک عمل جاری رہتا ہے۔ قیامت برپا ہونے کا یقین ہو اس لمحے میں بھی شاخ کھجور کی بوائی جاری رہتی ہے۔

اسلام کے مفہوم میں عمل کی قدر و قیمت کی اہمیت پر زور اور عمل پر انگیخت کا تصور انتہائی واضح صورت میں موجود ہے لیکن یہاں جو چیز قابلِ توجہ ہے وہ صرف عمل کی قدر و قیمت نہیں بلکہ یہ ہے کہ عمل ہی دراصل آخرت کا واحد راستہ ہے۔

ماضی میں اور عصر حاضر میں انسانیت پر کئی ایسے ادوار آئے جب یہ محسوس کیا گیا کہ دنیا اور آخرت کے راستے جدا جدا ہیں اور یہ اعتقاد رہا کہ آخرت کمانے کے لیے دنیا سے کنارہ کش ہونا ضروری ہے اور دنیاوی مشاغل آخرت کو برباد کر دیتے ہیں۔

دین و دنیا کی تفریق کا صرف یہی ایک مظہر نہیں ہے بلکہ یہ فرقت انسانی ذہن میں بہت گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے اور مزید آگے بڑھ کر یہ ان تمام مطالب و مفاہیم میں سرایت کر جاتی ہے جن کا تعلق فی الجملہ کسی نہ کسی طور انسانی وجود سے ہے۔ مثلاً

جسم و رُوح میں تفریق۔

مادی اور غیر مادی میں تفریق۔

طبعیات اور مابعد الطبعیات میں تفریق۔

عملی زندگی اور مثالی زندگی (اخلاقی نظریات) کے درمیان تفریق اور اسی قسم کی دیگر تفریقات جو صرف ایک نقطہ سے پیدا ہوتی ہیں یعنی دین و دنیا کی تفریق سے۔ حالانکہ انسان کا نفسیاتی وجود اپنی تخلیقی فطرت کے لحاظ سے ایک اکائی ہے جس میں جسم، رُوح، عقل، مادہ اور لا مادہ سب یکجا ہیں جس میں جسم کی شہوتیں، نفس کی رغبتیں، عقل کا غور و فکر اور رُوح کی جولانیاں سب شامل ہیں جس میں حسِ غلیظ کے جذبات اور فکرِ آزاد کے تاملات اور رُوح کی آرائیں سب موجود ہیں۔ بے شک اس وجودِ انسانی کے یہ اجزا ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور مختلف سمتوں کی طرف مائلِ پرواز ہیں اور ان جزئیات کو اگر ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے میلان و رجحان کے مطابق پروان چڑھتی رہیں گی لیکن اس انسانی وجود میں ایک عجوبہ یہ ہے (وجود اصل

اس کی اس فطرت کا اعجاز ہے جس پر اللہ نے انسان کو پیدا فرمایا ہے) کہ ان منتشر اجزاء کو مجتمع کرکے ایک وحدت کی صورت میں مربوط کیا جاسکتا ہے اور پھر یہ اجزاء ایک مربوط وحدت میں متحد ہو کر روئے زمین کی ایک عظیم قوت بن جاتے ہیں۔ اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب یہ فانی انسان ہمیشہ رہنے والی ازلی طاقت سے اقتباسِ نور کرکے خود بھی منور اور مشتعل ہو جاتا ہے اور نور کی طرح آزاد ہو کر مادی اور لامادی کا امتیاز مٹا دیتا ہے۔ دراصل وجودِ انسانی کے ان منتشر اور متضاد پہلوؤں کو متحد کرنے اور ایک وحدت میں یکجا کرنے کا سب سے بہتر ذریعہ یہی ہے کہ دنیا اور آخرت کو ایک ہی منزل کا راستہ قرار دے دیا جائے۔

اس صورت میں یعنی جب دین و دنیا ایک قرار پا جائیں گے انسانی زندگی عمل اور عبادت میں اور نفس انسانی جسم و روح میں تقسیم ہونے سے بچ جائیں گے اور مقاصد عملی اور نظری میں یا واقعی اور مثالی میں منقسم ہونے سے محفوظ رہیں گے

جب دنیا و آخرت کے راستے مل جل جاتے ہیں اور اس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، کہ دونوں ایک ہیں تو یہی ہم آہنگی نفس کی اندرونی دنیا میں واقع ہوتی ہے اور متضاد سمتیں قریب آجاتی ہیں۔ اور منتشر جہتیں باہم مل جاتی ہیں۔ پھر یہ سب باہم مربوط و منطبق ہو کر ایک ہی چیز بن جاتی ہیں اور پھر یہ نفس مفرد اپنے یک شدہ وجود کے ساتھ حیاتِ اعظم کے وجود سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اس حالت میں کہ ان کے مقاصد میں وحدت اور اجزاء میں ربط پیدا ہو چکا ہوتا ہے اس وقت نفس انسانی حیاتِ اعظم سے ملاقی ہو کر راحت حاصل کرتا ہے اور اسی کی جولان گاہ کا ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کے مدار (فضا) میں اس طرح محو گردش رہتا ہے جس طرح منفرد سیارے کائنات کی فضا میں دوسرے مداروں اور سیاروں سے ٹکرائے بغیر گردش کرتے رہتے ہیں اور سب ایک ہی عالمگیر قانون کے پابند ہوتے ہیں۔

اور اسلام نے یہ معجزہ بڑی آسانی سے کر دکھایا۔ اسلام نے یہ عجوبہ دنیا و آخرت کو ایک نظام میں مربوط کر کے دکھایا ہے۔ ملاحظہ کیجیے ارشادِ باری تعالیٰ: وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (قصص ۷۷) "جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔" نیز ارشاد ہے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ۚ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ (اعراف ۳۲) "اے محمدؐ! ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا۔ اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں۔ کہو یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان لانے والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس چونکہ فکرِ اسلامی کی حقیقی اور مکمل تعبیر و تفسیر تھی اسی لیے آپ کے نزدیک دنیا اور آخرت ایک ہی راستہ اور دین و دنیا ایک ہی شے تھی۔[1] بعینہٖ ان مسلمانوں نے یہ بات بھی سمجھ لی تھی کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم نہایت وسیع ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ اسلام کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ عبادت کا مسلک و منہج ہے لیکن اس میں عبادت صرف نماز، روزہ اور حج، زکاۃ وغیرہ کے مروج مناسک میں ہی محدود نہیں ہے بلکہ اسلام میں عبادت کے بہت ہی وسیع اور گہرے معنیٰ ہیں اور وہ ہیں اللہ سے مسلسل اور دائمی رابطہ۔ اور یہ رابطہ و تعلق ہی دراصل وہ جامع نصابِ تربیت ہے جس سے زندگی کے باقی تمام اعمال کی شاخیں پھوٹتی ہیں اور بالآخر اسی کی طرف واپس لوٹتی ہیں۔

نماز، روزہ، حج و زکاۃ اور عبادت کے باقی سب شعائر و مظاہر دراصل عبادت

[1] یہ عبارت کتاب "قبسات من الرسول" سے لی گئی ہے۔ (مصنف)

کی مباویات ہیں یا یہ اثنارِ سفر کے وہ پڑاؤ ہیں جہاں سب مسافر راستے میں رُک کر اپنا زادِ سفر حاصل کرتے ہیں ورنہ پورے کا پورا راستہ ہی عبادت ہے اس میں جس قدر مذہبی مراسم و ارکان ہیں جتنا عمل یا فکر و شعور ہے جب تک اس کا مقصد اللہ کی رضا ہے وہ سب عبادت ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے عبادت پوری زندگی کا احاطہ کر لیتی ہے ورنہ محض زندگی کے وہ چند لمحات جن میں یہ مخصوص مراسم ادا کیے جائیں، عبادت نہیں ہیں اور نہ قرآن مجید کی آیۂ مبارکہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (الذاریات ۵۶) "میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔" کا یہ مقصد تھا (کہ یہ سب ہر وقت مراسمِ ظاہری ادا کرتے رہیں) اگر عبادت صرف ان ظاہری مراسمِ عبادت کا ہی نام ہو تو صحیفۂ کائنات میں ان چند لمحات کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جو اپنا کوئی اثر چھوڑے بغیر فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ ان کی تو قدر و قیمت جب ہی ہے جب عبادت پوری زندگی کا نظامِ عمل ہو اور یہی فکر و عمل اور شعور کا ایسا چارٹر (دستور العمل) ہو جس سے واضح طور پر ہر لحظہ کے مثبت اور منفی عمل کی تفصیل معلوم ہو سکے اور ان تمام امور کا مرجع و مرکز ذاتِ باری تعالیٰ ہو کہ ہر معاملہ میں اسی کی طرف رجوع کیا جائے اور ہر لمحہ اسی کے دستور سے رہنمائی حاصل کی جائے اور یہ رہنمائی قلب و شعور اور عقل و عمل سب کے لیے ہو۔

اسلام میں عبادت کا دراصل یہی مفہوم ہے۔ اس کے معنٰی یہ ہرگز نہیں ہیں، کہ انسان دُنیا چھوڑ دے یا یہ کہ ہر وقت مناسکِ عبادت ادا کرتا رہے اور رہبانیت اختیار کر لے۔ نہ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ رکوع و سجود کے وقت تو دل پر خوفِ خُدا چھایا رہے اور جب نماز ختم ہو جائے تو اندر کی دنیا میں طمع و لالچ اور سرکشی کے جذبات سے ہل چل مچ جائے۔ یا امانت و دیانت پر قائم رہنے سے گریز کرنے لگے۔ یا حق کی مدد میں

کمزوری دکھانے لگے اور اس حقیقی دنیا میں نتیجہ خیز عمل سے دست کش ہو کر بیٹھ جائے۔

ہرگز نہیں عبادت کے یہ معنی قطعاً نہیں ہیں اور نہ ایسے شخص کا اللہ سے دلی رابطہ ہے بلکہ یہ شخص راہِ عبادت کے مقامات میں بھٹکا ہوا اور سرگرداں ہو گا منزل کا مُسافر نہیں ہو سکتا۔ عبادت تو دراصل مسلسل راہِ منزل پر گامزن رہتے ہوئے اثنارِ راہ میں وقتاً فوقتاً زادِ راہ حاصل کرنے کے لیے رُکنے کا نام ہے۔ تاکہ قلب کو مناسب غذا حاصل ہوتی رہے جو اسے آمادۂ عمل رکھ سکے اور انسان مزید آگے بڑھ سکے۔

اسلام میں یہ بات واضح ہے کہ دنیوی عمل ہی عبادت ہے اگر قلب اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو: لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا۔ وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (البقرہ ۱۷۷) "نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یومِ آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔ یہ ہیں راست باز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔"

یہ ہے اسلام کا مقرر کردہ عباداتی نصاب و منہج اور اسی پر اس نے انسان کی تربیت کی بنیاد رکھی ہے۔ اس کی بنیادی شرائط اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوصِ نیت اور

تقویٰ (جناب باری کے ساتھ مسلسل رابطہ استوار رکھنا) ہیں

اس دور کے مسلمان یہ بات خوب جانتے تھے کہ اسلام کے معنی ہی سربلند ہونا ہیں، وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آلِ عمران ۱۳۹) اور دل شکستہ نہ ہو غم نہ کرو تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو" آیۂ کریمہ میں استعلاء (غلبہ) مومنوں کا وصف بتایا گیا ہے لیکن اس کا ذریعہ بھی اس طرح محدود و متعین کر دیا گیا ہے کہ کسی مغالطہ کا امکان نہ رہے اور وہ ہے "اِن کنتم مومنین" یعنی اس غلبہ کا ذریعہ صرف ایمان ہے یعنی واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ اس سربلندی کا منبع و منشا، کوئی مادی قوۃ نہیں ہے اور نہ دولت ہے اور نہ اس زمین کی نظریاتی قوتوں میں سے کوئی قوت ہے یعنی نظریہ "ذرائع پیداوار" یا نظریہ قومی و نسلی عصبیت وغیرہ یعنی استعلاء و غلبہ کے وہ ذرائع و عناصر جن سے انسان اپنے ہر دورِ جاہلیت میں کام لیتا رہا ہے بلکہ اسلام میں استعلاء کا واحد ذریعہ اور منبع صرف ایمان باللہ ہے۔

اسلام مومنوں کو صرف استعلاء کا مشورہ ہی نہیں دیتا بلکہ یہ ان کی اُس "حق" کے مطابق تربیت بھی کرتا ہے جس کے مقابل باطل نہیں ٹھہر سکتا۔ گویا ایک مومن شخص جو اللہ کی ہدایت پر کاربند ہونے کی وجہ سے کائنات اور زندگی کے ناموس سے بھی باخبر ہے وہ یقیناً تمام مخلوقات سے اعلیٰ و ارفع ہے کیونکہ وہ کائنات پر ان لوگوں کے مقابلہ میں جنھیں دولتِ ایمان حاصل نہیں کہیں زیادہ بلند افق سے نظر ڈالتا ہے اور ایک مومن کا تصور اللہ، کائنات اور زندگی کے بارے میں عام انسانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ عظیم و عمیق ہوتا ہے بالخصوص انسان اور انسانی زندگی سے متعلق اس کا نظریہ اتنا وسیع اور جامع ہوتا ہے کہ غیر مومن شخص اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

چنانچہ انسان زندگی اور کائنات کے بارے میں مومن کا یہ وسیع اور ہمہ گیر تصور و شعور ہی مومن کی اس ذہنی اور روحانی قوت کا سرچشمہ ہے جو خارجی دنیا میں اسے سربلندی عطا کرتی ہے۔ اس لیے کہ یہ سربلندی جس طرح نفس کی دنیا میں پیدا ہوتی ہے اسی

طرح خارجی دنیا میں بھی وقوع پذیر ہوتی ہے۔ قرونِ اُولیٰ کے مسلمان اس حقیقت کی گہرائی اور گیرائی کے تمام پہلوؤں سے بھی پوری طرح باخبر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے ہر شخص دل میں ایمان کے داخل ہوتے ہی خود کو ایک نیا اور رُوئے زمین پر موجود ہر قسم کی جاہلیت سے بلند و برتر خیال کرنے لگتا تھا۔

اور یہ محض اس لیے نہیں تھا جیسا کہ بادی النظر میں محسوس ہوتا ہے کہ توحید کا شعور نفسِ انسانی پر بُتوں اور بُت پرستی کی بے مائیگی کو پوری طرح واضح کر دیتا ہے اور اس وجہ سے ایک موحد خود کو بہت بلند محسوس کرنے لگتا ہے۔ اگرچہ یہ خود ایک حقیقت ہے لیکن غلبہ حاصل کرنے کے لیے یہی کل حقیقت نہیں تھی۔ اس لیے کہ بُت پرستی صرف عقیدہ ہی نہ تھا کہ مومن اپنے فکر و ضمیر سے اس کا مقابلہ کر کے اس سے بلند ہو جاتا۔ بلکہ یہ ایک مادی اور نظریاتی قوت بھی تھی جو انسانوں، مال و دولت اور ہتھیاروں کی شکل میں موجود تھی۔ جس طرح یہ قوت ٹھوس شکل میں ان کے نفوذ و اقتدار میں موجود تھی اور جس طرح یہ قوت مسلمانوں کو ایذا رسانی کی قدرت میں اور ہدایت کے لوگوں تک پہنچنے کے راستے میں حائل ہونے کے لیے متشکل و مجسم ہو جاتی تھی۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اپنی قلتِ تعداد اور کمزوری کے باوجود جن قوتوں پر غلبہ حاصل کیا تھا وہ یہ سب تھیں حالانکہ انھیں کوئی قوت و طاقت حاصل نہ تھی مگر وہ باطل کی تمام تدبیروں کے مقابل ڈٹ گئے تھے تاآنکہ اس پر غالب آ گئے۔

تو یہ استعلاء صرف فکر و شعور کا استعلاء نہ تھا بلکہ یہ استعلاء خارجی دنیا میں اپنا حقیقی وجود رکھتا تھا اور اسے جاہلیت کی ان مادی اور نظریاتی قوتوں سے مقابلہ درپیش تھا جو مسلمانوں کا راستہ روکے کھڑی تھیں اور ہر طریقہ سے ان کو کچلنے کے درپے تھیں۔

پھر جب مسلمانوں کا روم و ایران سے مقابلہ ہُوا تو ایک بار پھر مسلمان اس جاہلیت پر غالب آ گئے جو مادی اور معنوی قوت کے لحاظ سے مسلمانوں سے کہیں زیادہ طاقت ور تھی۔

جب مسلمانوں نے روم وایران سے مقابلہ کیا تھا تو ان پر اپنی عددی قوت سے غالب نہیں آئے تھے کیونکہ مسلمان دشمن کے مقابلے میں انتہائی قلیل تعداد میں تھے اور نہ یہ مقابلہ دولت کے بل بوتے پر جیتا تھا، کہ مسلمان اس وقت ایک غریب قوم تھی جو مشکل سے گزر اوقات کرتی تھی۔ اور نہ ہتھیاروں کے زور پر یہ کامیابی حاصل کی تھی کیونکہ دشمن نہ صرف اسلحہ کی اقسام میں مسلمانوں پر فوقیت رکھتا تھا بلکہ اسے حربی تنظیم اور فنونِ جنگ میں مکمل مہارت اور دسترس حاصل تھی جس سے عرب قطعاً ناآشنا تھے۔ اسلام سے پہلے عرب محض چھوٹی موٹی لوٹ مار کیا کرتے تھے، مسلمانوں کو یہ فتح ان کی عربیت کی بنا پر بھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ یہ درست ہے کہ عرب ہمیشہ اپنی عربیت پر فخر کرتے آئے تھے لیکن اس عربیت نے ان میں روم وایران سے مقابلہ کی طاقت کبھی نہیں پیدا کی تھی۔ بلکہ اس کے برعکس بعض عرب قبائل ان بادشاہوں کے اثر و نفوذ کو بڑھانے کی خدمت سرانجام دیتے تھے۔ اور اعراب کے حملوں کو روکنے کے لیے معاوضہ پر کام کیا کرتے تھے۔ مسلمانوں نے یہ کامیابی اپنی تہذیب کی وجہ سے بھی حاصل نہیں کی تھی اس لیے کہ روم وایران کی بادشاہتیں تہذیب وتمدن کے اعتبار سے تاریخ کے ہر دور میں جزیرۂ عرب کے باسیوں کے مقابلہ میں بے انتہا اعلیٰ وارفع رہی ہیں۔ ان مسلمانوں کو صرف ایک ہی چیز کی بنا پر یہ غلبہ حاصل ہوا تھا یعنی اللہ پر ایمان کامل کی بنا پر، وہ اپنے اس احساس کی وجہ سے ان پر غالب آگئے کہ وہ مومن ہیں اور تمام مخلوق سے افضل و برتر ہیں خواہ ان کے مدمقابل کی عددی قوت، جنگی طاقت، سازوسامان کی کثرت، تہذیب وتمدن، نظم ونسق اور آئین وقانون کی برتری اور عمدگی کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ اس لیے کہ یہ سب چیزیں اللہ کی ہدایت کو قبول کیے بغیر اور اس کی شریعت کا اتباع کیے بغیر جاہلیت اور گمراہی ہیں۔

پھر وہ معجزہ ظہور پذیر ہوا جسے اللہ کے علم کے مطابق انسانوں کے اسلام اور ایمان کی بنا پر بلند ہوجانے کی صورت میں ظاہر ہو کر رہنا تھا۔ چنانچہ ایمان کی برکت سے

علو حاصل کرنے والی یہ قوت ہر میدان میں آگے بڑھی۔ انھوں نے علم حاصل کیا۔ فنون حرب سیکھے، ہر قسم کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اور تہذیب وتمدن میں کمال حاصل کر کے واقعی دنیا میں یہ حقیقت ثابت کر دکھائی کہ وہ دنیا کی تاریخ میں عظیم تر قوت ہیں۔ اتنی حیران کن تیزی کے ساتھ مشرق ومغرب پر چھا گئے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ اور غالب آ کر ہر طرف ہدایت پھیلائی اور اپنے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے باطل کو نابود کر دیا۔

مسلمان جب بھی کامیاب ہوئے ان کی کامیابی کا باعث یہ نہ تھا کہ ان کی افرادی قوت زیادہ تھی یا ان کے پاس دولت یا جنگی طاقت فراواں تھی یا علم وفن اور تہذیب وتمدن میں بام عروج پر پہنچے ہوئے تھے ان کے غلبہ اور سربلندی کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ مومن تھے اور حق پر تھے۔ اور ان کے گرد و پیش کی جاہلیت باطل پرست تھی۔ پھر اس کامیابی کے بعد انھیں افرادی قوت بھی حاصل ہو گئی مال و دولت بھی آ گئی جنگی طاقت میں بھی اضافہ ہو گیا اور علم وفن اور تہذیب وتمدن میں بھی ترقی حاصل کر لی۔ گویا انھیں ایمان کی بنا پر پیدا ہونے والی داخلی سربلندی کی وجہ سے خارجی دنیا میں بھی غلبہ اور ہر قسم کی قوت وشوکت حاصل ہو گئی۔

قرونِ اولیٰ کے ان مسلمانوں نے اسلام کے مفہوم میں یہ بات بھی سمجھ لی تھی، کہ انسان روئے زمین کی ایک موثر اور فعال قوت ہے۔ یہ بات انھوں نے جہاں قرآن و حدیث کی روشنی میں سمجھی تھی عملاً بھی اس حقیقی زندگی میں دیکھ لی تھی جو وہ آں حضرت ﷺ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں گزار رہے تھے۔ انھوں نے ارشاد باری تعالیٰ: وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (البقرہ ۳۰) "پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔" سے یہ حقیقت سمجھ لی تھی کہ انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہونے کی بنا پر اس بات کا ذمہ دار ہے کہ محنت ومشقت کر کے اس زمین کو آباد کرے اور یہاں افزائش

حیات کا عمل جاری رکھے: یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ (الانشقاق ۶) "اے انسان تو اپنے رب کے پاس پہنچنے تک کام میں کوشش کر رہا ہے پھر قیامت میں اس کام کی جزا سے جا ملے گا۔" اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خلافتِ ارضی کی اس ذمہ داری کو نبھانے کے لیے کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے مسخر کر دی اور اس کے تابع فرمان بنا دی ہے: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (الجاثیہ ۱۳) "اس نے زمین و آسمان کی ساری چیزوں کو تمھارے لیے مسخر کر دیا سب کچھ اپنے پاس سے۔" لیکن انسان پر لازم ہے کہ یہ مسخر کیا ہوا رزق اور قوت اپنی ذاتی کوشش اور محنت سے خود حاصل کرے: هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ (الملک ۱۵) "وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو تابع کر رکھا ہے، چلو اس کی چھاتی پر اور کھاؤ خدا کا رزق۔"

اسی طرح انھوں نے آیۂ کریمہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد ۱۱) "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔" سے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا کہ زندگی کے واقعات علی الحساب رُونما نہیں ہو جاتے۔ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ ہر واقعہ اللہ تعالیٰ کے ارادے سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اور زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اس کا علم اللہ کے پاس ہے اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں لیکن یہ بھی اللہ کی مشیّت کا تقاضا تھا کہ انسان کو جو زمین میں اللہ کا نائب ہے عزت بخشنے کے لیے ایسا مثبت کردار عطا فرمایا جائے کہ زمین پر اللہ کا ارادہ اور فیصلہ انسانی ارادہ کے ذریعہ نافذ ہو اور اس طرح انسان کا ارادہ اور انسان کا عمل ہی دراصل تاریخ ساز بنے اور واقعات و حادثات کو وقوع میں لانے کا وسیلہ قرار پائے۔ اس لیے کہ قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے آزاد قدرت و اختیار کے باوجود کسی قوم کی حالت خود نہیں بدلتا اور ان میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں لاتا

جو وہ اپنے لیے نہ چاہتے ہوں۔

بعینہٖ انھوں نے آیۂ کریمہ: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ (الروم ۴۱) "خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے۔" کا یہ مفہوم سمجھا تھا کہ فساد کوئی غیبی تقدیر نہیں ہے جو زمین پر خدا کی طرف سے نازل کر دی جاتی ہے اور انسان کو اس کے اسباب معلوم نہیں ہوتے بلکہ فساد زمین میں لوگوں کے اپنے اعمال کی وجہ سے پھیلتا ہے گویا انسان ہی اس زمینی زندگی کی وہ مؤثر قوت ہے جس کے اعمال کے مطابق نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اچھے کام کرے گا تو اچھا نتیجہ اور بُرے کام کرے گا تو بُرا نتیجہ برآمد ہوگا۔

مذکورہ بالا تمام مطالب و مفاہیم سے (جو انھوں نے قرآن مجید اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شر کے خلاف جہاد اور ہدایت کی نشر و اشاعت سے اخذ کیے تھے اور اس واقعی صورتِ حال سے اخذ کیے تھے جس میں وہ جزیرہ نمائے عرب کی جاہلیت اور دیگر جاہلیتوں کے بالمقابل زندگی گزار رہے تھے) یہ سمجھا تھا کہ انھیں واقعی صورت میں خود کام کرنا ہوگا۔ یہ دین جس پر وہ ایمان رکھتے ہیں اور جسے خیرِ محض سمجھتے ہیں۔ یہ دین نہ از خود قائم ہو جائے گا اور نہ از خود اس کی نشر و اشاعت ہو سکتی ہے (اگرچہ اللہ تعالیٰ ایسا کرنے پر قادر ہے) بلکہ یہ دین ان کی اپنی کوشش سے، اپنے دین کی حفاظت کرنے سے قائم ہوگا اور جتنی حفاظت اور کوشش کریں گے اتنا ہی قائم رہے گا۔ نیز یہ کہ اگر وہ دین کے کسی چھوٹے یا بڑے معاملے میں کمزوری یا سستی دکھائیں گے تو اسی قدر دین میں کمزوری آ جائے گی چنانچہ ان پر لازم ہے کہ ہر وقت بیدار رہیں۔ اپنی بقا کی غرض سے مسلم معاشرے کی خاطر اور اس پوری دُنیا کی خاطر انھیں بیدار رہنا ہوگا۔ ورنہ کوئی کامیابی کوئی قوت اور کوئی غلبہ و اقتدار حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے کہ یہ سب کچھ صرف صحیح ایمان سے ہی ہو سکتا ہے بلکہ ایمان کا

مطلب ہی یہی ہے اور اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل ارشاد کے بھی معنیٰ یہی ہیں :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔ (آلِ عمران ۲۰۰) "اے لوگو جو ایمان لائے ہو. صبر سے کام لو باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ. حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو. اور اللہ سے ڈرتے رہو. اُمید ہے کہ فلاح پاؤ گے"۔

ولفرڈ کانٹ ویل اسمتھ اپنی کتاب "اسلام تاریخ جدید میں" کے صفحہ ۳۰۲ پر تاریخ کے بارے میں ہندوؤں، عیسائیوں، مسلمانوں اور مارکسیوں کے نقطۂ نظر کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :

"ایک مسلمان بالکل مارکسی انداز میں ہندو سے یکسر مختلف یہ محسوس کرتا ہے، کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے دُور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں جن سے بچنا ممکن نہیں ہے اور یہ کہ مضبوط اور راست بنیادوں پر اجتماعی زندگی کا قیام ہی سب سے بلند اور قطعی مقصد ہے. نیز یہ ایک حقیقت ہے کہ رُوئے زمین پر آج تک انصاف کے لیے جتنی کوششیں کی گئی ہیں یا کی جا رہی ہیں ان میں اسلام کی کوشش سب سے زیادہ جدوجہد کی حامل رہی ہے۔ اور مارکسی نظام کے قیام سے قبل اسلام کی ہی کوشش اس مقصد کے لیے سب سے عظیم اور سب سے اعلیٰ و ارفع کوشش تھی. لیکن اسلامی اور مارکسی نقطہ نگاہ میں یہ فرق ہے کہ اسلام میں ہر دنیوی واقعہ کے دو رُخ ہیں اور مسلمان ہر معاملہ کو دو پہلوؤں سے دیکھتا ہے. مثلاً وہ محسوس کرتا ہے کہ انسان کی ہر حرکت عالمِ آخرت اور عالمِ دنیا دونوں میں بیک وقت رونما ہوتی ہے دنیوی اُمور میں جو چیز اجتماعی روش اور اجتماعی عمل کا مظاہرہ کرتی ہے وہی روش بعینہٖ اسی وقت انفرادی اعمال کا مجموعہ بھی ہوتی ہے اور قیامت کے دن ہر فرد جماعت کے مجموعی اعمال میں سے اپنے انفرادی عمل کے لیے بھی جواب دہ ہوگا یعنی ہر عمل کے کچھ متعین نتائج تو اس دُنیا میں ظاہر ہوتے

ہیں اور کچھ عالمِ آخرت میں ظاہر ہوں گے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ہر عمل کو اس کے ذاتی اعتبار سے بھی پرکھا جائے جس طرح اس کے تاریخی ارتقا کا اندازہ لگانا ضروری ہے۔

مابعد الطبعیات کا ایک عالم کہہ سکتا ہے کہ اعمال کے بارے میں حکم کا یہ انداز اس دُنیا جس میں ہم رہتے ہیں اور انسان کے اس مرکب جس سے انسان کا وجود عبارت ہے اور زندگی جس سے ہماری تاریخ معیشت تشکیل پاتی ہے کی موضوعی حقیقت سے قریب تر ہے. کسی بھی جانب دارانہ نقطۂ نگاہ سے زمین میں فی الواقع جاری اخلاقی اقدار سے بلند تر اقدار کے وجود سے انکار ممکن نہیں ہے. تاریخ کے اپنے اثرات اور اپنے مضمرات ہیں لیکن یہ مضمرات اس کی اپنی ذات میں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ تاریخ میں رونما ہونے والے واقعات سے بھی بلند تر کچھ معیارات اور پیمانے ہیں اور انہی پیمانوں اور معیاروں سے تاریخی حوادث پر حکم لگانا ممکن بھی ہے اور ضروری بھی. چنانچہ اسلامی فکر میں عملاً انہی معیاروں کے مقتضا کے مطابق حکم لگایا جاتا ہے

قرونِ اولیٰ کے مُسلمانوں کے ذہن میں اسلام کا مفہوم اس انداز کا تھا. اور اسی مفہوم کے اصول و فروع کے نتیجہ میں اسلامی معاشرے کے وہ امتیازات پیدا ہوئے جن کی وجہ سے مسلمانوں کی ایک مخصوص طرز و روش بن گئی اور جن کی وجہ سے یہ معاشرہ اگلے پچھلے تمام معاشروں سے ممتیز اور نمایاں ہوگیا اور یہی اسلامی معاشرے کی وہ خصوصیت ہے جسے تمام مسلمان مؤرخ اور مستشرقین بطور خاص بیان کرتے ہیں۔

اس معاشرے کی نمایاں خصوصیت اللہ اور رسول کی ایسی اطاعت تھی جس میں کسی قسم کی سستی اور شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی. اگرچہ اطاعت میں کمی بیشی کے لحاظ سے لوگوں میں انفرادی طور پر فرق بھی موجود تھا۔ اور ان میں ایسی بشری کمزوریاں بھی تھیں جو انسان کے مقامِ بلند تک پہنچنے اور اس پر قائم رہنے میں حائل ہو جاتی ہیں لیکن اس سے اس حقیقتِ واقعی میں کوئی فرق نہیں پڑتا جو من حیث المجموع اس معاشرے کی امتیازی

علامت تھی۔ اس امتیاز کو وہ بھی بیان کرتے ہیں جو خود اس معاشرے کے اندر رہتے تھے اور وہ بھی جو اس کو باہر سے دیکھ رہے تھے۔ اور مؤرخین بھی اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ اس معاشرے کا امتیازِ خصوصی اللہ و رسول صلی اللہ علیہ و سلم کی بے لاگ شک و شبہ اور سستی سے بلند اطاعت و فرمانبرداری تھی۔

اسلامی معاشرے کے علاوہ ایسا کبھی نہیں ہُوا کہ کوئی معاشرہ صرف اللہ کے احکام نافذ کرنے اور پُورے معاشرے کو صرف اللہ کی تعلیم کے مطابق قائم رکھنے کی کوشش کرنے کے لیے قائم ہُوا ہو اور یہ نتیجہ ہو اس بات کا کہ وہ اللہ کی تعلیمات پر پکّا اور سچا ایمان رکھتا ہے ایسا ایمان جو اس کے نفس کی گہرائیوں میں مُرتسم ہو چکا ہے۔

اس معاشرے کا ہر فرد اپنے اسلامی مزاج کی وجہ سے یہ محسوس کرتا تھا کہ اس پر کچھ مخصوص ناگزیر ذمّہ داریاں ہیں جن سے وہ کسی طرح نہیں بچ سکتا۔ یہاں تک کہ اگر اس میں کبھی کمزوری پیدا ہو جاتی اور ادائے فرض سے قاصر رہتا تو اپنی کمزوری کا اعتراف کرتا اور یہ نہ کہتا کہ میرا فیصلہ بہتر یا اللہ و رسول کے حکم سے زیادہ صحیح تھا۔ ہر شخص یہ بات محسوس کرتا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا مکلّف اور احکامِ الٰہی نافذ کرنے کا پابند ہے۔ اس پر یہ ذمّہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مسلمان ہو اور اسلامی تعلیمات کو نافذ کرے۔ وہ اس بات کا پابند ہے کہ اس کی تمام شخصی زندگی صرف کلیات میں ہی نہیں بلکہ باریک ترجزئیات میں بھی اس معیار کے مطابق ہو جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کے لیے مقرر کر دیا ہے حتیٰ کہ سلام کرنے کا انداز، نشست و برخاست کا اسلوب اور چہرے اور دانتوں کو صاف کرنے کا طریقہ بھی وہی ہونا چاہیے جو اسلام نے بتایا ہے۔

مسلمان اپنے دل کی گہرائی میں یہ احساس رکھتا تھا کہ احکامِ الٰہی میں چھوٹے بڑے یا اہم اور غیر اہم یا ضروری اور غیر ضروری کی تفریق ممکن نہیں بلکہ سب اہمیت کے لحاظ سے

برابر ہیں سوائے ان اُمور کے جن میں خود اللہ تعالیٰ نے رخصت یا عزیمت کا اختیار دیا ہے گویا ایک مسلمان صرف یہ کر سکتا ہے کہ جو احکام واضح ہیں ان کی اطاعت بھی کرے اور انھیں نافذ بھی کرے اور یہ اطاعت اور نفاذ اللہ پر پکّے اور سچے ایمان کے ساتھ ہو اور اس بات پر بھی ایمان ہو کہ انسان اس وقت تک مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک احکامِ الٰہی پوری طرح اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی متعین کردہ صورت میں نافذ نہ کرے اور اس سلسلے میں دانتوں میں مسواک کرنا اور میدانِ جنگ میں جہاد کرنا دونوں برابر حیثیت کے حامل ہیں یہاں تک کہ مسلمان اس قسم کے دو (بظاہر غیر مرتُوط) معاملات کو باہم اتنا مرتُوط خیال کرتے تھے کہ ایک جنگ میں کامیابی کی تاخیر کا سبب انھوں نے مسواک نہ کرنے کو سمجھا تھا اور ایک دُوسرے کو اس ضروری حکم کی تعمیل کی طرف توجہ دلائی تھی تاکہ وہ فتح کے مستحق قرار پائیں کیونکہ مسواک اور جہاد دونوں حکموں کا منبع اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے:

ہر مسلمان یہ محسوس کرتا تھا کہ اس پر ایک فرض انفرادی حیثیت میں عاید ہوتا ہے اور ایک فرض اس کی معاشرتی حیثیت میں عاید ہوتا ہے۔ ذاتی اور انفرادی فرض جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہ ہے کہ بقدرِ استطاعت اس کا فکر و شعور اور عملی طرز و روش پوری طرح اس اسلامی صورت کے مطابق ہو جو قرآن و سُنت نے پیش کی ہے۔ چنانچہ وہ انسانوں سے محبت کرے کسی سے کینہ نہ رکھے کسی کی غیبت نہ کرے کسی پر زبانِ طعن دراز نہ کرے، کسی کی عزت پر حملہ کر کے ایذا نہ پہنچائے اور نہ کسی کے مال و جان پر دست درازی کرے ہر شخص کے ساتھ خلوص و محبت، خیر خواہی اور دوستی کے جذبات کے ساتھ برتاؤ کرے ہر کام میں رضائے باری تعالیٰ ملحوظ رکھے کسی سے دھوکہ نہ کرے، نہ کسی کا حق چھینے اور نہ مال غصب کرے، کسی حکم پر عمل کی قدرت رکھتے ہوئے عمل سے گریز نہ کرے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے عاید ذمّہ داریوں کو پُورا کرے جن میں سب سے پہلی ذمّہ داری اللہ پر ایمان اور اس کے رب ہونے کا یقین رکھنا اور اس کی اطاعت کرنا ہے اور انہی سے اور بہت سی ذمّہ داریاں

متنوع ہوتی ہیں چنانچہ باقی عبادات معاملات میں ان سب کو پورا کرے۔ اور اس پر معاشرے کی طرف سے یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ اپنے معاشرے کو اسلام کی پاک اور مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے عملی جدوجہد میں حصّہ لے اور اس سلسلے کی تمام ذمّہ داریاں پوری کرے اس لیے کہ محض کسی کا اپنی ذاتی حیثیت میں ایک مسلمان کی طرز وروش اختیار کرلینا کافی نہیں ہے بلکہ مکمل اور صحیح اسلام کے لیے ضروری ہے کہ اس کا معاشرہ بھی پوری طرح اسلامی تصویر کے مطابق ہو اور اس مقصد کے لیے جس قسم کی محنت ومشقت اور جدوجہد برداشت کرنا پڑے اسے برداشت کرے۔

ہر مسلمان مرد ہو یا عورت یہ محسوس کرتا تھا کہ یہ عمل اس کا ذاتی فریضہ بھی ہے اور معاشرتی بھی جس سے بچنا یا پیچھے ہٹنا یا اس میں تذبذب اور سُستی دکھانا کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دورِ اول کا معاشرہ مجموعی طور پر انتہائی پاک صاف اور پُرنور تھا۔ اور یہ پاکیزگی اس کے اخلاق، سیاست، معیشت، اجتماعی روابط اور فکری رُوحانی اور جنگی عمل میں غرض زندگی کے تمام پہلوؤں میں موجود تھی۔ یہ مسلمان اس انداز میں نہیں سوچتا تھا کہ وہ صرف اپنی نجی زندگی میں رب کی عبادت کرلینے کے بعد جو عملی طرز وروش اختیار کرلے یا کسی غیر مسلم معاشرے کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لے تو کوئی فرق نہیں پڑتا، اسی طرح وہ یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ معاشرے کو اسلام سے منحرف ہونے کی حالت میں رہنے دے اور اس انحراف کو روکنے کے لیے کوئی کوشش نہ کرے اور مسلمان بھی رہے۔ اسی طرح اس زمانے کی کوئی عورت یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ وہ صرف اپنی ذاتی زندگی میں اللہ کی عبادت کرلینے کے بعد اپنے لباس، آرائشِ جسم اور مَردوں سے برتاؤ اور فکروشعور کے معاملہ میں جیسی بھی روش اختیار کرلے یا جس غیر اسلامی معاشرے کے مطابق خود کو ڈھال لے مسلمان رہ سکتی ہے۔ اسی طرح وہ یہ تصوّر بھی نہیں کرسکتی تھی کہ معاشرے کی اصلاحِ احوال اور اس کو اسلام

کے مطابق بنانے میں جدوجہد کیے بغیر مسلمان رہ سکتی ہے۔

سب مسلمان مرد وعورت پوری طرح یہ سمجھتے تھے کہ ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ان پر بہت بڑی ذمّہ داری عاید ہوتی ہے ان کی اپنی ذات کے اعتبار سے بھی اور معاشرتی زندگی کے اعتبار سے بھی کہ وہ اپنی اور معاشرے کی ہر چھوٹی اور بڑی بات کے سلسلے میں ہر وقت چوکنا رہیں اور مسلسل یہ محسوس کرتے رہیں کہ وہ ان تمام امور کے لیے اپنے اللہ کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اور ان پر لازم ہے کہ اللہ کے محاسبے سے پہلے خود اپنا احتساب کریں تب ہی وہ مُسلمان ہوسکتے ہیں۔ اسلام کے اسی مفہوم کو پوری طرح سمجھ لینے کا نتیجہ تھا کہ اس وقت کی اسلامی جماعت یہ محسوس کرتی تھی کہ وہ اللہ کی اطاعت اور اس کی شریعت کی پیروی کی بدولت ہی رُوئے زمین کی سب سے اعلیٰ قوّت ہے۔ وہی ایسی زبردست اور غالب قوت ہے جسے انسانیت کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لے کر اسے صراطِ مستقیم پر چلانا چاہیے۔ ان کے اس احساس میں دُنیا کی دُوسری غیر مسلم گمراہ جماعتوں کے ساتھ مادی یا معنوی قوتوں میں موازنے یا ہمسر اور کمتر ہونے کے خیال نے کبھی مداخلت نہیں کی۔ اس لیے کہ اگر مُسلمان افرادی قوت، اسلحہ جنگ کی کثرت اور سائنس اور تہذیب میں برتری یا تنظیمی صلاحیت میں تفوق کی مادی اور معنوی قوتوں میں اپنا غیر مسلموں سے موازنہ کیا کرتے یا اس بات کو خاطر میں لاتے تو لڑائی سے پہلے ہی پسپا ہوجاتے بلکہ کبھی آگے بڑھنے کا تصوّر ہی نہ کرتے اور دل ہی دل میں خود کو شکست خوردہ، کمزور وکمتر اور ذلیل وحقیر محسوس کرکے جنگ کے خیال سے دست بردار ہوجایا کرتے۔

ان کے لیے تو ایک ہی حقیقتِ کبریٰ قابلِ اعتنا تھی اور یہی وہ حقیقت ہے جس میں سے باقی سب حقیقتیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ یہ کہ چونکہ وہ مومن ہیں اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اطاعت گزار ہیں اس لیے وہی سربلند ہوں گے اور

ان کے مقابلے میں رُوئے زمین کی باقی سب طاقتیں حقیر و ذلیل ہیں جنھیں خاطر میں نہیں لانا چاہیے۔ اور پھر یہ بات ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آئی اور یہ لوگ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کی وجہ سے حقیقتاً رُوئے زمین کی ایسی برتر قوت بن کر ہر لحاظ سے غالب اور ہمہ گیر طاقت ثابت ہوئے اور پوری انسانیت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیکر اسے صراطِ مستقیم پر چلاتے رہے۔

اس احساس کا نتیجہ محض جنگی فتوحات ہی نہ تھیں۔ اگرچہ مُسلمانوں کی جنگی فتوحات خود انسانی تاریخ کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہیں بلکہ درحقیقت اسلام ایک ایسی زبردست تحریک ثابت ہُوا جو زندگی کے ہر پہلو کے لیے پیغامِ حیات بن کر انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں داخل ہوگیا۔ چنانچہ ہر وہ تہذیب و نظام جو اسلام کے راستے میں حائل ہُوا اسلام اسے بڑی تیزی سے اپنے مزاجِ خاص کے مطابق اس انداز میں ڈھالتا چلا گیا کہ ان تہذیبوں کی کچھ چیزیں جو قابلِ قبول تھیں بعینہٖ اپنے اندر سمو لیں کچھ باتیں یکسر متروک قرار دے دیں اور کچھ میں اپنے مخصوص تصوّرات و اقدار کے مطابق مناسب تبدیلیاں کرکے اس میں بڑی تیزی سے اسلامی رُوح داخل کردی اور وہ تہذیب و نظام اسلامی تہذیب اور اسلامی نظام بن گئے اور یہی تہذیب و نظام اپنی اسلامی شکل و صورت میں مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ ہر جگہ پھیلتے چلے گئے یعنی مسلمانوں کو جو علم مفتوحہ ممالک میں ملا انھوں نے بڑی تیزی سے اس میں سے صحیح حصّہ اخذ کرکے اس پر علمی اور تحقیقی اضافے کیے اسے گہرائی اور وسعت بخشی پھر اسے اسلامی رنگ میں رنگ کر اور اسلامی علم کا نام دے کر اپنے ساتھ ہر مفتوحہ علاقے میں پھیلایا اور پھر نہ صرف مُسلمانوں نے اس سے استفادہ کیا بلکہ رُوئے زمین پر علم کا ہر پیاسا اس سے سیراب ہُوا۔

"پروفیسر گب" اپنی کتاب "اسلام میں جدید رُجحانات" (MODERN TRENDS IN ISLAM) میں لکھتا ہے: میرا یقین ہے کہ یہ بات مُسلّم ہے کہ مسلمانوں کے عمیق اور تفصیلی

مطالعہ نے علمی عرفان کی ترقی میں ٹھوس مادی مدد دی ہے اور مسلمانوں کے اسی مُطالعہ کی بدولت قرونِ وسطیٰ میں تجربہ اور مشاہدہ کا ضابطہ اور اصول یورپ پہنچا تھا۔

نیز "بریولٹ" اپنی کتاب "تعمیرِ انسانیت" (THEMAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے: "عربی تہذیب نے نئی دنیا کو جو کچھ عطا کیا ہے اس میں سب سے زیادہ اہم علم و سائنس ہے۔ ویسے صرف سائنس ہی وہ واحد چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے یورپ کو حیاتِ نَو ملی بلکہ اسلامی تہذیب کے اور بہت سے موثرات ہیں جن کی اوّلین شُعاعیں یورپی زندگی پر پڑیں۔ درحقیقت یورپ کے ارتقار کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسے قطعی اور یقینی طور پر اسلامی ثقافت کے موثرات کی جانب منسُوب نہ کیا جاسکے۔ یہ موثرات اس طاقت کے نشو و نما میں بہت ہی واضح اور نمایاں نظر آتے ہیں جس طاقت نے جدید دُنیا کو امتیازی اور مستحکم قوت عطا کی ہے اور جو اس کے عرُوج و ارتقار کا اصل ماخذ ہیں یعنی علومِ طبعیہ اور سائنسی تحقیق و تجسّس"۔

ان سب باتوں کے علاوہ اللہ پر ایمان رکھنے والی اور اس کے احکام کی اطاعت کرنے والی اس مسلمان جماعت نے انسانیت کو ایسی روایات و اسالیب اور ایسے اقدار و اصول عطا کیے ہیں جو آج بھی جبکہ دُنیائے اسلام زوال پذیر ہوچکی ہے اور انسانیت کی رہنمائی اور سرپرستی کی ذمّہ داری سے دست کش ہوچکی ہے انسانیت کی بنیادوں میں بہت گہرے اُترے ہُوئے ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اسلام سے بیزار اور اس کے خلاف چالیں چلنے والے مغربی مُصنّفین بھی اقرار و اعتراف کرتے ہیں۔

قرونِ اُولیٰ کے ان مسلمانوں کے اسلامی مفہوم کی حقیقی تصویر اسی وقت ہمارے ذہنوں میں مکمل ہوسکتی ہے اور اس کو پُوری طرح ہم اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب ہم اسلامی زندگی کی ان واقعی اور عمومی تفصیلات اور منظر کشی کو سامنے رکھیں جو "اسلامی معاشرے کے نمونوں" میں پیش کی گئی ہے۔

اسلامی معاشرے کی چند جھلکیاں

ہم نے گزشتہ باب میں کہا تھا کہ اسلام کے وسیع المعنی مطالب کا تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہم ان مطالب کی وہ عملی تصویر نہ دیکھ لیں جو اس معاشرے کی زندگی میں نظر آتی ہے جس نے ان مطالب و مفاہیم کو عملاً اختیار کیا اور اس پر پوری طرح عمل کیا۔

عام طور پر (اور یہ ایک طبعی امر ہے) اسلامی معاشرے کا نمونہ جب بھی پیش کیا جائے گا اس کا ماخذ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور آپ کے ان اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم کی پاک زندگیاں ہوں گی جو تاریخ عالم کی انتہائی نادر اور غیر فانی شخصیتیں ہیں اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ ایک قدرتی امر ہے اس لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک تو ہر اعتبار سے مثالی اور ہر لحاظ سے رہنما تھی۔ آپ کی حیاتِ طیبہ کے تمام لمحات مسلمانوں کے سامنے کھلے ہوئے ہیں تاکہ یہ مبارک زندگی ان کے لیے ایک مکمل ابدی نمونے کا کام دے۔

مسلمان اپنی زندگی کے تمام معاملات میں آپ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور حسبِ استطاعت کوشش کرتے ہیں کہ آپ کی ذات سے ہدایت حاصل کریں، آپ کی پیروی کریں اور زندگی کی ہر مصیبت اور ہر مشکل مرحلے میں آپ ہی کے اُسوۂ حسنہ سے رہنمائی حاصل کریں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ حضرات تاریخ انسانی کی نادرۂ روزگار اور ممتاز ہستیاں تھے اور بے شک یہ انسان

ہی تھے لیکن ایسے انسان جن کی پاک رُوحیں آفاقی انوار سے سیراب ہو کر عام سطح سے بلند ہو گئی تھیں اور یہ لوگ انسانیت کے لیے ایسے نمونے بن گئے تھے جن سے انسانیت کو ہر حالت اور ہر دَور میں شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ ان بزرگوں کی تقلید اور ان کے اعمال افکار اور خیالات کی اقتدا مسلمانوں کے لیے ہر دَور میں ایک مستحسن کوشش رہی ہے اور مُسلمان اپنی وسعت و مقدرت کے مطابق ان نمونوں تک رسائی حاصل کرتے رہے ہیں۔

چنانچہ جب بھی اسلامی معاشرے کی ایسی مکمل اور واضح تصویر پیش کی جائے گی جس کے انمٹ نقوش تاریخ عالم کے صفحات پر ثبت ہیں تو قدرتی طور پر اس کا خاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی متبرک زندگیوں سے ہی لیا جائے گا۔ مگر ہم اس کتاب میں بالخصوص جس اسلام کی بات کریں گے وہ عوامی اسلام ہو گا (اگر یہ اصطلاح صحیح ہے) یعنی وہ اسلام جو ہر فرد سے مطلوب ہے اور جس کے متعلق یہ تصور ہے کہ اس پر ہر شخص عمل کر سکتا ہے اور جس میں لوگوں کی صلاحیتوں اور قوتوں کے فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور جس میں انسان کی ان فطری کمزوریوں کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے جو انسان کو اس کی قدرت و صلاحیت کے مطابق بلندی تک پہنچنے سے روکتی رہتی ہیں یا اگر کبھی اس مقامِ بلند تک پہنچ جاتا ہے تو یہ کمزوریاں انسان کو اس مقام پر قائم نہیں رہنے دیتیں۔

چنانچہ ہم اس کتاب میں خاص طور پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے نمونے پیش کرنے پر اکتفا نہیں کریں گے۔ اگرچہ آپ کی ذاتِ مُبارک ہر دَور اور ہر نسل کے لیے رہبر و رہنما ہے اور نہ صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی زندگیوں کی مثالوں پر ہی انحصار کریں گے جبکہ اِن حضراتِ کرام کی زندگیاں بلاشک وشبہ اسلام کا اعلیٰ ترین نمونہ اور اسلام پر عمل کا حاصل ہیں۔ بلکہ ہم اپنی اس کتاب میں ان عام افراد کی زندگیوں کے نمونوں پر بھی انحصار نہیں کریں گے جو بعض ادوار میں بلندی حاصل کر کے ضمیرِ کائنات میں ہمیشہ زندہ

رہنے والے نامور افراد بن گئے خواہ تاریخ نے محض ان کے نام ہی یاد رکھے ہیں یا بے نام کی شخصیت کے طور پر ان کا تذکرہ کیا ہے۔

بلکہ ہم ان تمام نمونوں کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشروں میں انسانی کمزوریوں کی مثالیں بھی پیش کریں گے۔ یعنی وہ حالات بھی بیان کریں گے جن میں یہ لوگ اپنی مطلوبہ رفعت و عظمت برقرار نہ رکھ سکے، تاکہ ایک طرف اسلامی معاشرے کے تمام حالات و کیفیات کی حقیقی تصویر سامنے آجائے اور دُوسرے۔ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اسلام نفسِ انسانی اور افتادِ بشری سے معاملہ کرتے وقت ایک حقیقت پسند نظام ہے جو انسانوں پر نہ تو ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالتا ہے اور نہ ان کے لیے ایسی فرضی رفعت و عظمت کو ضروری قرار دیتا ہے جو کبھی زوال پذیر نہ ہو اور نہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ لوگ مسلمان بننے کے لیے اپنی بشریت سے کنارہ کش ہو جائیں بلکہ اسلام انسانوں سے ان کی انسانی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے معاملہ کرتا ہے اور ان سے ان ہی باتوں کا مطالبہ کرتا ہے جو انسان کی مقدرت میں ہیں۔ تیسرے۔ اس حقیقی منظر کشی کا مطلب یہ بھی ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اسلام اسلامی معاشروں میں انسانی زندگی پر طاری ہونے والی کمزوری کے اُن عارضی لمحات کو کس انداز میں لیتا ہے جو دُنیاوی جذب و کشش کی وجہ سے انھیں لاحق ہوتے ہیں اور پھر ان کا علاج کس طرح کرتا ہے تاکہ نفوسِ انسانی از سرِ نو بلند ہو کر مطلوبہ معیار تک اور پھر پسندیدہ معیار تک پہنچ سکیں۔

اب ہم مسلم معاشروں کے چند نمونے جیسے جیسے سامنے آتے جاتے ہیں بغیر کسی مخصوص اور متعین ترتیب کے آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں

دَورِ نبوی ﷺ کی چند مثالیں

ایک دن ایک اعرابی نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کوئی چیز مانگی۔ آپ نے وہ چیز اسے دے دی اور فرمایا: کیا میں نے تمھارے ساتھ بہترین سلوک کیا ہے؟ اعرابی نے کہا نہیں، آپ نے بہترین سلوک نہیں کیا۔ صحابہ کرامؓ اعرابی کی اس بات پر بھڑک اٹھے۔ آپ

نے لوگوں کو کوئی حرکت نہ کرنے کا حکم دیا اور حجرہ مبارکہ میں تشریف لے گئے اور اس اعرابی کو مزید کچھ عطا فرمایا اور دریافت کیا کہ کیا اب میں نے تمہارے ساتھ بہترین سلوک کیا ہے؟ کہنے لگا جی ہاں! اللہ آپ کو اور آپ کے خاندان کو اس کا بہتر اجر دے۔ پھر آپؐ نے اس اعرابی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم نے کچھ ایسی باتیں کہی تھیں جن کی وجہ سے میرے ساتھیوں کو رنج پہنچا ہے۔ چنانچہ اگر تم پسند کرو تو ان کے سامنے بھی وہ بات کہہ دو جو تم نے اب کہی ہے تاکہ تمہاری طرف سے ان کی رنجش دُور ہو جائے۔ اعرابی نے کہا اچھّا۔ چنانچہ دُوسرے دن وہ اعرابی پھر حاضرِ خدمت ہو گیا۔ اور آپؐ نے اپنے صحابہ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس اعرابی نے کل کچھ کہا تھا جس پر ہم نے اسے مزید کچھ دیا تھا اور غالباً یہ خوش ہو گیا تھا۔ آپؐ نے اعرابی سے دریافت فرمایا کیا ایسا ہی ہے؟ اعرابی نے عرض کیا جی ہاں! اللہ آپ کو اور آپؐ کے خاندان کو اس کا اچھا اجر دے۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا۔ اس اعرابی کی اور میری مثال اس شخص کی سی ہے جس کی اُونٹنی بدک گئی تھی اور لوگ اس کے پیچھے دوڑ پڑے تھے جس کے نتیجہ میں اُونٹنی مزید دوڑنے لگی۔ چنانچہ اس نے ان لوگوں کو آواز دی اور کہا تم لوگ مجھے اور میری اُونٹنی کو تنہا چھوڑ دو۔ میں اس سے زیادہ مانوس اور اس کے مزاج سے زیادہ واقف ہوں چنانچہ اونٹنی والا خشک گھاس ہاتھ میں لے کر سامنے کی جانب سے اونٹنی کے قریب آیا اور آہستہ آہستہ اسے لوٹانے لگا یہاں تک کہ وہ آکر اپنے کھونٹے پر بیٹھ گئی۔ اس نے اس پر اپنا کجاوہ کسا اور سوار ہو گیا۔ اسی طرح اگر میں تم لوگوں کو اس اعرابی کی بات پر اپنا ردِعمل ظاہر کرنے سے منع نہ کر دیتا تو تم اسے قتل کر دیتے اور یہ جہنم میں چلا جاتا۔

امام احمدؒ، بخاریؒ اور مسلمؒ نے زہریؒ سے روایت کیا ہے زہریؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے عبدالرحمٰنؒ بن عبداللہؓ بن کعبؓ بن مالک نے بیان کیا کہ ان سے خود کعبؓ بن مالک کے بیٹے عبداللہؓ نے (جو حضرت کعبؓ کے نابینا ہو جانے کے بعد ان کی

رہبری کیا کرتے تھے) یہ بیان کیا ہے کہ میں نے حضرت کعبؓ (اپنے والد) کو غزوہ تبوک میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ جانے اور پیچھے رہ جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے سُنا ہے۔ حضرت کعبؓ کہتے تھے کہ میں سوائے تبوک کے کسی غزوہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت سے محروم نہیں رہا اور اس زمانہ میں جب میں غزوہ تبوک میں شرکت سے محروم رہا میرے حالات یہ تھے کہ میں جتنا طاقتور اور خوش حال اس موقعہ پر تھا پہلے کبھی نہیں ہُوا تھا حتیٰ کہ میرے پاس پہلے کبھی دو اُونٹنیاں نہ تھیں جبکہ اس وقت موجود تھیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر جب بھی کسی جنگ پر تشریف لے جاتے تھے بصراحت اس مقام کا نام نہ لیا کرتے تھے لیکن جب تبوک کا موقعہ آیا سخت گرمی کا موسم تھا ایک طویل سفر درپیش تھا بے آب وگیاہ میدانوں میں سے گزرنا تھا اور کثیر التعداد دشمن سے مقابلہ تھا اس لیے آپؐ نے مسلمانوں پر پُوری صورتِ حال واضح کر دی تھی تاکہ وہ دشمن سے مقابلہ کی مکمل تیاری کر لیں چنانچہ آپؐ نے وہ سمت بھی بتا دی جدھر جانے کا ارادہ تھا۔ اس موقعہ پر آپؐ کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد بھی اتنی زیادہ تھی کہ ان کو کسی رجسٹر میں درج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرت کعبؓ بیان کرتے ہیں کہ اسی بنا پر کچھ لوگ جو اس جنگ میں شرکت سے بچنا چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ مُجاہدین کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے ان کی غیر حاضری کا علم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ ہو سکے گا۔ اِلّا یہ کہ بطورِ خاص اس کے بارے میں بذریعہ وحی آپؐ کو اطلاع دے دی جائے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنگ پر روانگی کا ارادہ ایسے وقت میں فرمایا جب پھل پک چکے تھے اور سائے خوشگوار ہو گئے تھے اور میرا دھیان ان چیزوں کی طرف لگا ہُوا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور مسلمانوں نے تیاریاں شروع کر دیں اور میری یہ کیفیت تھی کہ میں روزانہ تیاری کے لیے سب کے ہمراہ جاتا لیکن کوئی کام مکمل کیے بغیر واپس آجاتا اور اپنے دل

میں کہتا کہ میں تو جب بھی چاہوں گا یہ کام مکمل کر لوں گا۔ اسی کیفیت میں کافی دن گزر گئے مسلمانوں نے تیزی سے تیاری مکمل کر لی۔ اور ایک صبح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجاہدین کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے مگر میں کوئی تیاری نہ کر سکا اور مجاہدین آگے بڑھ گئے۔ پھر میں نے ارادہ کیا کہ میں بھی چل پڑوں اور ان سے جا ملوں۔ کاش میں نے ایسا کر لیا ہوتا لیکن پھر یہ بھی نہ کر سکا۔ آپؐ کے تشریف لے جانے کے بعد جب میں لوگوں کے پاس جاتا تو یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا تھا کہ یہ لوگ جو میری طرح پیچھے رہ گئے تھے صرف وہ تھے جن پر یا تو منافق ہونے کی تہمت تھی یا جن کو اللہ نے معذور ہونے کی بنا پر مستثنیٰ قرار دیا تھا۔ اس اثنا میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا خیال نہ آیا۔ تبوک پہنچنے کے بعد ایک موقع پر آپؐ صحابہ کرام کے ہمراہ تشریف فرما تھے کہ آپؐ نے لوگوں سے دریافت فرمایا کہ کعبؓ بن مالک کو کیا ہوا؟ بنی سلمہ میں سے ایک شخص نے عرض کیا؛ یا رسول اللہ اسے خوش حالی اور سستی نے روک لیا ہے اس پر حضرت معاذؓ بن جبل نے کہا کہ تم نے اچھی بات نہیں کہی۔ پھر آں حضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہم نے کعبؓ میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں پایا۔ یہ بات سن کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔

حضرت کعبؓ بن مالک کہتے ہیں کہ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبوک سے واپسی کی اطلاع ملی تو میں سخت پریشان ہو گیا اور جھوٹے بہانے گھڑ گھڑ کر سوچنے لگا کہ ان میں سے کون سا بہانہ کل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی سے نجات دلا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میں نے اپنے خاندان کے عقل مند لوگوں سے بھی مشورہ لیا۔ پھر جب مجھے اطلاع ملی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بس آیا ہی چاہتے ہیں تو میری آنکھوں کے آگے سے باطل کا پردہ ہٹ گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ بول کر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ میں نے سچ بولنے کا عزم کر لیا۔ پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ آپؐ کا معمول تھا کہ جب بھی سفر سے واپس آتے پہلے مسجدِ نبوی میں جا کر دو رکعت نماز ادا فرمایا کرتے اس کے بعد لوگوں سے ملاقات کے لیے تشریف فرما ہوتے۔ اس مرتبہ بھی جب حسبِ معمول آپ نماز سے فارغ

ہو کر تشریف فرما ہوئے تو جو لوگ اس غزوہ میں پیچھے رہ گئے تھے انھوں نے حاضرِ خدمت ہو کر اور قسمیں کھا کھا کر بہانے بیان کرنے شروع کیے۔ یہ افراد اسّی سے کچھ زیادہ تھے۔ آپؐ نے ان کے بیان کردہ عذر قبول فرما لیے اور ان سے بیعت لی اور ان کے لیے دعائے مغفرت فرمائی اور ان کی حقیقتِ حال اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دی۔ بالآخر میں حاضرِ خدمت ہوا اور میں نے سلام عرض کیا۔ آپؐ نے تبسم فرمایا جس میں غصہ کی آمیزش تھی۔ پھر مجھے قریب آنے کا حکم ہوا جب میں آپ کے سامنے بیٹھ گیا تو آپ نے دریافت فرمایا کہ تمھارے تخلف (پیچھے رہ جانے) کی کیا وجہ تھی۔ کیا تم نے سواری نہیں خریدی تھی؟ میں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ اگر میں آپ کی بجائے کسی دنیادار آدمی کے سامنے ہوتا تو میں اس کی ناراضگی سے نجات پانے کے لیے کوئی بہانہ بنانے کی سوچتا۔ کیونکہ میں باتیں بنانا جانتا ہوں۔ لیکن خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ اگر آج میں آپؐ کے سامنے کوئی جھوٹا بہانہ بناؤں جس کی وجہ سے آپؐ مجھ سے راضی بھی ہو جائیں تب بھی عنقریب اللہ تعالیٰ آپؐ کو حقیقتِ حال سے باخبر کر دے گا اور آپؐ مجھ سے پھر ناراض ہو جائیں گے۔ لیکن اگر میں اس وقت سچ بولوں جس کی بنا پر آپؐ مجھ سے ناراض بھی ہو جائیں پھر بھی اس صورت میں مجھے اللہ کی جانب سے بہتر انجام کی امید ہے۔ بخدا میرے لیے (اس غزوہ میں جانے سے کوئی عذر مانع نہ تھا۔ خدا کی قسم اس موقع پر (جبکہ میں آپؐ کے ساتھ نہ جا سکا) جتنا خوشحال اور قوی تھا پہلے کبھی نہیں تھا۔ اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ یہ شخص ہے جس نے سچ بولا ہے پھر فرمایا کہ اب جاؤ اور انتظار کرو حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ تمھارے بارے میں خود کوئی فیصلہ نہ فرما دے۔ چنانچہ میں آپ کی مجلس سے اٹھ کر چل پڑا۔ راستہ میں قبیلہ بنی سلمہ کے کچھ افراد میرے ساتھ ہو لیے اور کہنے لگے کہ بخدا جہاں تک ہم جانتے ہیں تم نے اس سے پہلے کوئی گناہ نہیں کیا پھر تم اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی عذر پیش کرنے سے کیوں قاصر رہے جیسا کہ دوسرے پیچھے رہ جانے والوں نے پیش کیے تھے؟ تمھارے قصور کی معافی کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی دُعائے مغفرت کافی تھی۔ حضرت کعب کہتے ہیں ان لوگوں نے مجھے اتنی ملامت کی کہ میرا ارادہ ہوگیا کہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی پہلی بات کو غلط کہہ دوں۔ مگر میں نے ان سے پوچھا کہ میرے جیسا معاملہ کسی اور کے ساتھ بھی پیش آیا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ ہاں دو شخص اور بھی ہیں جن کے ساتھ یہی برتاؤ ہوا ہے انھوں نے بھی وہی بات کہی تھی جو تم نے کہی ہے اور آپؐ نے انھیں بھی وہی جواب دیا جو تمھیں ملا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ دونوں کون ہیں؟ بتایا۔ ایک مرارۃ بن الربیع اور دُوسرے ھلال بن اُمیّہ واقفی۔ گویا انھوں نے ایسے دو نیک اشخاص کے نام لیے جو بدر میں شریک ہوچکے تھے چونکہ ان کا عمل میرے لیے ایک مثال اور نمونہ تھا۔ ان کا ذکر سن کر میں اپنے پہلے فیصلے پر قائم رہا۔

حضرت کعبؓ بیان کرتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دُوسرے پیچھے رہ جانے والوں کو نظر انداز کرکے صرف ہم تین افراد سے لوگوں کو بول چال سے منع فرمادیا اور مسلمانوں نے ہم سے میل جول بند کردیا۔ گویا لوگ ہمارے لیے بالکل بدل گئے حتیٰ کہ میری اپنی سرزمین میرے لیے بیگانہ ہوگئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ وہ علاقہ ہی نہیں ہے جسے میں جانتا تھا۔ پچاس روز تک ہماری یہی حالت رہی۔ میرے دونوں ساتھیوں پر تو گویا سکتہ طاری ہوگیا تھا اور وہ خانہ نشین ہوگئے تھے۔ لیکن چونکہ میں ان کے مقابلے میں مضبوط اور طاقت ور تھا اس لیے گھر سے نکلا کرتا تھا، نمازوں میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوا کرتا تھا اور بازاروں میں گھوما پھرا کرتا تھا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتا اور نماز کے بعد جب آپؐ تشریف فرما ہوتے تو آپؐ کو سلام کرتا اور جائزہ لیتا کہ میرے سلام کے جواب میں آپؐ کے لب مبارک متحرک ہوئے یا نہیں؟ پھر میں آپؐ کے قریب ہی نماز میں مشغول ہوجاتا، اور چور نظروں سے آپؐ کی طرف دیکھتا رہتا۔ چنانچہ جب میں نماز میں مشغول ہوتا آپؐ میری طرف دیکھتے اور جب میں آپؐ کی طرف دیکھتا آپؐ اپنا رُخِ مبارک دُوسری طرف کرلیتے حتیٰ کہ جب مسلمانوں کا مقاطعہ بہت طویل ہوگیا تو ایک دن میں "ابو قتادہؓ" کے گھر کی دیوار پھلانگ کر

ان کے پاس پہنچ گیا۔ ابو قتادہؓ میرے چچازاد تھے اور مجھے ان سے بہت پیار تھا۔ میں نے انھیں سلام کیا لیکن بخدا انھوں نے سلام کا جواب نہ دیا۔ میں نے کہا ابو قتادہؓ! اللہ کی قسم کھا کر کہو کیا تمھیں یہ نہیں معلوم کہ مجھے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبّت ہے؟ مگر وہ خاموش رہے۔ میں نے دوبارہ یہی بات دہرائی لیکن پھر بھی کچھ نہ بولے۔ جب میں نے تیسری مرتبہ قسم دلائی تو کہنے لگے اللہ اور اس کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں یہ سُن کر میرے آنسو جاری ہوگئے اور میں دیوار پھاند کر واپس آگیا۔

اسی زمانہ میں ایک دن میں مدینہ کے بازار میں پھر رہا تھا کہ شام کا رہنے والا ایک نبطی جو مدینہ میں کھانے کی چیزیں فروخت کرنے آیا تھا لوگوں سے پُوچھتا پھر رہا تھا کہ کعب بن مالک کہاں رہتے ہیں کوئی مجھے ان کا پتہ بتا دے؟ لوگوں نے اشارے سے میری جانب متوجّہ کیا چنانچہ وہ میرے پاس آگیا اور اس نے مجھے شاہ غسّان کا خط دیا۔ میں پڑھنا جانتا تھا۔ جب میں نے اسے پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ "ہمیں معلوم ہُوا ہے کہ تمھارے دوست (حضرت محمدؐ) نے تم پر زیادتی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ذلیل و خوار ہونے کے لیے نہیں پیدا کیا تم ہمارے پاس چلے آؤ ہم تمھاری خاطر و مدارت کریں گے۔" میں نے خط پڑھ کر سوچا کہ یہ بھی ایک امتحان ہے اور وہ خط میں نے تنور میں جھونک دیا۔ پھر ایک دن جب پچاس میں سے چالیس دن گزر چکے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک شخص آیا اور اس نے مجھے اطلاع دی کہ حضورؐ نے تمھیں اپنی بیوی سے علیحدہ رہنے کا حکم دیا ہے۔ میں نے کہا کہ طلاق کا حکم ہے یا کچھ اور۔ اس نے کہا نہیں اس سے کنارہ کش رہو، قربت نہ کرو۔ اسی قسم کا فرمان میرے دونوں ساتھیوں کو بھی پہنچا تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تم اپنے میکے چلی جاؤ اور وہیں رہو تا آنکہ اللہ تعالیٰ اس معاملے کا کوئی فیصلہ نہ فرما دیں۔ یہ حکم ملنے پر ھلال بن اُمیّہ کی بیوی نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ ہلال بہت کمزور اور بوڑھے ہیں اور ان کے پاس کوئی خادم بھی نہیں ہے تو کیا اس صورت میں میں ان

کی خدمت کرنا بھی آپؐ ناپسند فرمائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا نہیں۔ لیکن وہ تمہارے قریب نہ آئیں۔ انھوں نے عرض کیا کہ انھیں تو کسی چیز کا دھیان ہی نہیں ہے قسم بخدا جس دن سے یہ واقعہ ہُوا ہے وہ مسلسل رو رہے ہیں۔ ہلال کی بیوی کو اجازت ملنے پر میرے اہلِ خاندان نے مجھے بھی مشورہ دیا کہ میں بھی آپؐ سے اپنی بیوی کے بارے میں اجازت لے لوں۔ میں نے کہا کہ بخدا میں ہرگز اس قسم کی اجازت نہ لوں گا نہ معلوم آپؐ کیا فرمائیں جبکہ میں جوان بھی ہوں۔

حضرت کعبؓ کہتے ہیں ہمیں اس حالت میں دس دن اور رہنا پڑا گویا جب ہماری بول چال بند ہُوئے پچاس روز پورے ہو گئے۔ پچاسویں رات کی صبح اپنے گھر کی چھت پر نماز ادا کر کے بیٹھا تھا اور میری حالت اس وقت بعینہٖ ویسی تھی جیسا کہ قرآن مجید میں ہمارے بارے میں بیان کیا گیا ہے: حَتّٰٓی اِذَا ضَاقَتْ عَلَیْہِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَیْہِمْ اَنْفُسُہُمْ ۔ (توبہ ۱۱۸) "جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں"۔ کہ اچانک مجھے ایک شخص کی آواز سنائی دی جو کوہِ سلع پر انتہائی بلند آواز سے چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا؟ "اے کعب بن مالک بشارت ہو"۔ یہ آواز سُنتے ہی میں سجدے میں گر پڑا اور سمجھ گیا کہ نجات کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ صبح کے وقت ہی لوگوں کو اطلاع دے دی تھی کہ اللہ تعالےٰ نے ہماری توبہ قبول فرمالی ہے چنانچہ لوگ ہمیں مُبارک باد دینے دوڑ پڑے تھے۔ کچھ لوگ میرے دونوں ساتھیوں کو خوشخبری دینے روانہ ہو گئے، ایک شخص گھوڑے پر سوار تیزی سے میری طرف چلا لیکن بنی اسلم کا ایک شخص دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور گھُڑ سوار کے پہنچنے سے پہلے اس کی آواز مجھ تک پہنچ گئی۔ اور جب وہ شخص جس کی مُبارک باد میں نے سب سے پہلے سُنی تھی میرے پاس پہنچا تو خوش خبری پہنچانے کے صلہ میں مَیں نے اپنے کپڑے اُتار کر اسے پہنا دیے۔ بخدا اس دن میرے پاس ان کپڑوں کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ اور خود دو کپڑے اُدھار مانگ کر پہن لیے اور آں حضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے ارادے سے چل پڑا۔ راستے میں لوگ گروہ در گروہ مجھ سے ملتے اور توبہ قبول ہونے کی مبارک باد دیتے کہ تم کو مُبارک ہو اللہ تعالیٰ نے تمھاری توبہ قبول فرمالی۔ جب مَیں مسجدِ نبوی میں پہنچا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اور لوگ آپؐ کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے مجھے دیکھتے ہی طلحہ بن عبیدؓ تیزی سے میری طرف بڑھے مجھے مبارک باد دی اور مصافحہ کیا۔ لیکن مہاجرین میں سے ان کے علاوہ اور کوئی نہ اُٹھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت کعبؓ حضرت طلحہؓ کے اس تپاک کو عمر بھر نہ بھُولے۔

حضرت کعبؓ کہتے ہیں کہ جب میں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپؐ کا چہرہ مبارک خوشی سے دمک رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: کعبؓ! اپنی پیدائش کے دن سے آج تک جتنے دن تم پر گزرے ہیں ان میں سب سے بہتر دن کی مبارک باد قبول کرو۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ معافی آپ کی طرف سے ہے یا اللہ کی طرف سے۔ آپؐ نے فرمایا اللہ کی طرف سے۔ خوشی کے موقع پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک اس طرح دمک اٹھتا تھا گویا چاند کا ٹکڑا ہو۔ اور اسی سے ہمیں آپ کی مسرت کا اندازہ ہُوا کرتا تھا۔ اس گفتگو کے بعد میں نے آپؐ کے قریب بیٹھ کے عرض کیا۔ یا رسول اللہ مَیں اپنی توبہ قبول ہونے کی خوشی میں اپنا مال اللہ و رسول کی خدمت میں بطور صدقہ نذر کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا اپنا کچھ مال اپنے پاس بھی رکھو یہی تمھارے لیے بہتر ہے۔ مَیں نے عرض کیا مَیں وہ حصہ رکھے لیتا ہوں جو خیبر میں ہے۔ نیز میں نے عرض کیا یا رسُول اللہ۔ اللہ تعالےٰ نے مجھے سچ بولنے کی وجہ سے اس مصیبت سے نجات دلائی ہے۔ اس لیے قبولِ توبہ کے شکرانے کے طور پر میں عہد کرتا ہوں کہ زندگی بھر صرف سچ بولوں گا۔ حضرت کعبؓ کہتے ہیں خدا کی قسم میرے علم میں مسلمانوں میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا سچ بولنے کے معاملے میں اللہ نے اتنا اچھا امتحان لیا ہو جیسا میرا اس دن سے لیا ہے جس

دن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عہد کیا تھا۔ چنانچہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جس دن سے میں نے رسول اللہ سے یہ عہد کیا ہے آج تک قصداً ایک لفظ بھی میری زبان سے جھوٹ نہیں نکلا اور مجھے اُمید ہے آئندہ بھی اللہ تعالیٰ مجھے جھوٹ سے محفوظ رکھے گا۔

ابن اسحٰقؒ غزوہ بنی المصطلق (جو سنہ ۶ھ میں مریسیع کے مقام پر ہوا تھا۔ مریسیع ایک چشمہ کا نام ہے) کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کے بعد اس چشمہ (مریسیع) کے قریب پہنچے تو کچھ لوگ پانی لینے کے لیے چشمہ پر آئے۔ حضرت عمرؓ کا ایک کارندہ جہجاہ بن مسعودؓ بھی جو قبیلہ بنی غفار میں سے تھا اپنے گھوڑے کو (پانی پلانے کے لیے) آگے لا رہا تھا۔ پانی پلانے کے مسئلہ پر جہجاہؓ اور سنان بن وبر جہنی (جو بنی عوف بن خزرج کا حلیف تھا) کے درمیان ٹھن گئی اور دونوں لڑائی پر آمادہ ہو گئے۔ جہنی نے انصار کو مدد کے لیے پکارا اور جہجاہؓ نے مہاجرین کو آواز دی۔ جب یہ عبداللہ بن ابی بن سلول بپھر گیا (اس کے ہمراہ کچھ افراد اس کے اپنے قبیلے کے بھی تھے انھی میں زید بن ارقمؓ تھے جو نوجوان تھے) اور کہنے لگا۔

کیا یہ لوگ (مہاجرین) جو کچھ کرنا چاہتے تھے کر گزرے؟ انھوں نے ہمارے درمیان نفرت پھیلا دی اور ہمارے ہی علاقے میں ہم پر چھا گئے ہیں۔ بخدا قریش کے ان بھگوڑوں نے (منافق مہاجرین کو بھگوڑا کہا کرتے تھے) ہمارے ساتھ وہی کچھ کیا ہے جیسے مثل مشہور ہے کہ "تمھارا کتا اتنا موٹا ہو گیا ہے کہ اب تمھیں کھا جائے گا"۔ خدا کی قسم جب ہم مدینہ پہنچ جائیں گے تو عزت مند لوگ ذلیل لوگوں کو وہاں سے نکال دیں گے"۔ پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا یہ مصیبت اپنے لیے تم نے خود مول لی ہے تم نے انھیں (مہاجرین کو) اپنے ملک میں آنے کی اجازت دی اور اپنے مال ان میں تقسیم کیے۔ کیا یہ دُرست نہیں ہے کہ اگر اس وقت تم ان کی مدد نہ کرتے تو یہ لوگ کسی اور

طرف چلے جاتے؟ یہ سب باتیں زید بن ارقمؓ نے بھی سُن لیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر بیان کر دیں (آپؐ اس وقت تک جنگ سے فارغ ہو چکے تھے) آپؐ کے پاس اس وقت حضرت عمرؓ بن الخطاب بھی موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے آپؐ سے عرض کیا۔ عباد بن بشرؓ کو حکم دیجیے کہ اس شخص (عبداللہ ابی) کو قتل کر دیں۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا نہیں! عمرؓ یہ کیسے ممکن ہے؟ لوگ کہیں گے کہ (حضرت) محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرا رہے ہیں۔ البتہ اب یہاں سے روانگی کا اعلان کر دو۔ کوچ کا یہ حکم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے وقت دیا جس وقت میں عموماً آپؐ سفر نہیں فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حکم کے مطابق لوگ روانہ ہو گئے جب عبداللہ بن ابی بن سلول کو معلوم ہوا کہ زید بن ارقمؓ نے جو باتیں اس کے مُنہ سے سُنی تھیں وہ آپؐ تک پہنچا دی ہیں تو وہ آپؐ کے پاس آیا اور قسم کھا کر کہنے لگا کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ چونکہ یہ شخص (عبداللہ بن اُبیّ) اپنی قوم میں کافی اثر و رسوخ کا مالک تھا اس لیے انصار میں سے جو اشخاص اس وقت حاضرِ مجلس تھے کہنے لگے یا رسول اللہ! ممکن ہے اس لڑکے (زید بن ارقمؓ) کو اس کی باتیں سمجھنے میں کچھ مُغالطہ ہوا ہو اور جو کچھ عبداللہ بن اُبیّ نے کہا تھا وہ زیدؓ کو یاد نہ رہا ہو۔ یہ بات دراصل عبداللہ بن ابی کی حمایت اور مُدافعت میں کہی گئی تھی۔

ابن اسحٰقؒ (مورخ) کہتے ہیں کہ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوئے تو اُسید بن حضیرؓ آپ سے آ کر ملے اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ نامناسب وقت میں کیوں روانہ ہو گئے۔ آپ تو ایسے اوقات میں سفر نہیں فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کیا تمھیں اُس بات کی اطلاع نہیں ملی جو تمھارے ساتھی نے کہی ہے۔ اُسیدؓ نے پوچھا یا رسول اللہ کون سا ساتھی۔ آپؐ نے فرمایا عبداللہ بن اُبی۔ عرض کیا اس نے کیا کہا؟ آپؐ نے فرمایا اس کا خیال ہے کہ جب وہ مدینہ پہنچے گا تو عزت مند لوگ ذلیل لوگوں کو مدینہ سے نکال دیں گے۔ حضرت اُسید بن حضیرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو سیدھی سی بات ہے اگر آپ چاہیں تو اسے وہاں

سے نکال دیجیے گا۔ خدا کی قسم وہ ذلیل ہے اور عزّت مند تو آپ ہیں۔ پھر کہنے لگے یارسول اللہ اس کے ساتھ نرمی اختیار کیجیے گا اس لیے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہمارے ہاں بھیجا اس کی قوم کے لوگ اس کے لیے منکوں کا تاج بنا کر پہنانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اب وہ یہ سمجھتا ہے کہ آپ نے اسے بادشاہت سے محروم کر دیا ہے۔

اس دن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کے ہمراہ تمام دن صبح سے شام تک چلتے رہے۔ پھر رات بھر سفر کیا یہاں تک کہ دوسرے دن دوپہر کو جب سُورج تکلیف دہ ہو گیا تو آپؐ نے قیام فرمایا۔ لوگ اتنے تھک گئے تھے کہ زمین چھوتے ہی سب سو گئے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تدبیر اس لیے اختیار فرمائی تھی تا کہ لوگوں کی توجہ عبداللہ بن اُبی کی گزشتہ روز کہی ہُوئی باتوں سے ہٹ جائے۔

ابنِ اسحٰق ؒ بیان کرتے ہیں کہ اسی اثنا میں عبداللہ بن ابی اور اسی جیسے منافقوں کے بارے میں سورۃ "منافقون" نازل ہو گئی۔ چنانچہ جب یہ سُورۂ مبارکہ نازل ہُوئی تو آپؐ نے زید بن ارقمؓ کا کان چھُو کر ارشاد فرمایا کہ یہ شخص ہے جس نے اپنے کانوں سے اللہ کا حق ادا کیا ہے۔ عبداللہ بن ابی کے بیٹے حضرت عبدُاللہ بن عبداللہ بن ابی کو بھی اپنے باپ کی حرکت کی اطلاع مل گئی۔ ابن اسحٰق ؒ کہتے ہیں مجھ سے عاصم بن عمر بن قتادہؓ نے بیان کیا کہ عبدُاللہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ مجھے معلوم ہُوا ہے کہ آپ عبداللہ بن ابی کو اس کی یاوہ گوئی پر قتل کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر آپؐ ضرور ایسا چاہتے ہیں تو مجھے حکم دیجیے میں اس کا سر آپؐ کی خدمت میں پیش کیے دیتا ہوں۔ خُدا کی قسم! اہلِ خزرج جانتے ہیں کہ ان کے قبیلہ میں ایک شخص بھی مجھ سے بڑھ کر اپنے باپ کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنے والا نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر آپؐ کسی دُوسرے کو اس کے قتل کا حکم دیں گے تو میں اپنے باپ کے قاتل کو لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا نہ دیکھ سکوں گا، اور اسے قتل کر دُوں گا اور ایک کافر کے بدلے میں مومن کو قتل کر کے جہنم میں چلا جاؤں گا۔

آپؐ نے فرمایا۔ نہیں! ہم اس کے ساتھ نرمی برتیں گے۔ اور جب تک وہ ہمارے ساتھ یہاں رہے گا اس سے اچھا سلوک کریں گے۔

"اس واقعہ کے بعد کیفیت یہ ہو گئی کہ جب بھی وہ کوئی حرکت کرتا اس کے اپنے لوگ ہی اس سے باز پُرس کرتے اور اس کے ساتھ سختی سے پیش آتے۔ چنانچہ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ ابن اُبی کی اس حالت کی اطلاع ملی تو آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ عمرؓ کیا خیال ہے؟ اگر عبداللہ بن ابی کو اسی وقت قتل کر دیا جاتا جب تم نے کہا تھا تو کیا اس کے لیے ہنگامہ کھڑا نہ ہو جاتا؟ جبکہ اب اگر میں اس کے قتل کا حکم دوں تو خود اس کی قوم اسے قتل کر دیگی۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ بخدا میں یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ آپؐ کا فیصلہ میرے فیصلے سے بہت ہی زیادہ برکت والا ہے۔

عکرمہؒ اور ابن زیدؒ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ مجاہدین جب مدینہ واپس پہنچے تو عبداللہ بن ابی کے بیٹے حضرت عبدُاللہ تلوار سونت کر مدینہ کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ لوگ گزرتے رہے یہاں تک کہ ان کا باپ عبداللہ بن اُبی پہنچا تو حضرت عبدُاللہ نے کہا آگے نہ بڑھنا! ابن ابی کہنے لگا کمبخت تجھے کیا ہُوا ہے؟ حضرت عبداللہ نے کہا خُدا کی قسم تم یہاں سے آگے اس وقت تک نہیں جا سکتے جب تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اجازت نہ دے دیں کیونکہ عزّت و اقتدار اُنؐ کے پاس ہے اور تم ذلیل ہو۔ یہاں تک کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے (آپؐ لشکر میں سب سے پیچھے چلا کرتے تھے، تا کہ پیچھے رہ جانے والوں، راستہ بھُول جانے والوں اور مدد کے مستحق لوگوں کی دیکھ بھال کر سکیں)، تو عبداللہ بن ابی نے آپؐ سے بیٹے کی شکایت کی۔ حضرت عبدُاللہ نے کہا، خُدا کی قسم یارسولؐ اللہ یہ آپؐ کی اجازت کے بغیر مدینہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ جب آپؐ نے اجازت مرحمت فرما دی تو حضرت عبدُاللہؓ اپنے باپ عبداللہ بن اُبی سے مخاطب ہو کر بولے کہ اب چونکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی ہے تم آ سکتے ہو۔

"عبداللہ بن ابی کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ایک مخلص، اطاعت کیش مسلمان کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے اور اپنے باپ کی وجہ سے سخت تکلیف میں مبتلا رہتے تھے، اس کی کرتوتوں سے آزردہ اور حرکتوں سے شرمندہ ہوتے رہتے تھے۔ لیکن ان کے دل میں اپنے باپ کے لیے بھی وہ جذبات تھے جو ایک نیک اور مہربان بیٹے کے باپ کے لیے ہونے چاہئیں اس لیے جب انھوں نے سنا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے باپ کے قتل کا ارادہ فرما رہے ہیں تو ان کا دل متضاد قسم کے جذبات و عواطف کی آماج گاہ بن گیا لیکن حضرت عبداللہؓ نے ان جذبات کا بڑی عمدگی، پاکیزگی اور بہادری سے مقابلہ کیا۔ انھیں اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت محبوب تھی اور دل سے چاہتے تھے کہ آپ کا حکم نافذ ہو خواہ وہ ان کے باپ کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو۔ مگر یہ بات بھی برداشت نہ کر سکتے تھے کہ کوئی شخص ان کے باپ کو قتل کرنے کے بعد زندہ چلتا پھرتا نظر آئے۔ انھیں ڈر پیدا ہوا کہ کہیں ان کا نفس دھوکہ نہ دے جائے اور وہ جاہلی عصبیت کے شیطان اور جوشِ انتقام پر غلبہ نہ پا سکیں۔ اس موقع پر حضرت عبداللہ اپنے قائدِ اعظم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے اپنے دل کے وسوسے بیان کرتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ آپ انھیں اس مصیبت سے نجات دلانے میں رہنمائی فرمائیں چنانچہ آپ سے عرض کرتے ہیں کہ اگر آپ ضرور میرے باپ کو قتل کرانا چاہتے ہیں تو مجھے حکم دیجیے کہ میں خود اس کا سر آپ کی خدمت میں پیش کر دوں تاکہ کوئی دوسرا یہ کام انجام نہ دے سکے۔ اس لیے کہ اس صورت میں وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکیں گے اور باپ کے قاتل کو اپنے سامنے چلتا پھرتا نہ دیکھ سکیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک مومن کو قتل کر کے خود جہنم کے مستحق ہو جائیں گے۔

"یہ دل کی لغزشِ مستانہ کا اتنا عظیم موقف ہے کہ انسان اس کا جس انداز اور جس پہلو سے بھی جائزہ لے دہشت زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یعنی قلبِ انسانی پر ایمان کی اثراندازی کی خوش جمال دہشت کہ ایمان انسان کے دل پر اثرانداز ہو کر کس حد تک کر

گزرنے پر آمادہ کر دیتا ہے۔ حضرت عبداللہؓ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کر رہے ہیں کہ ان کے سپرد وہ کام کر دیا جائے جو نفسِ انسانی کے لیے سب سے زیادہ مشکل ہے یعنی انھیں اپنے باپ کو قتل کر دینے کا حکم دیا جائے اور یہ درخواست پورے خلوصِ نیت سے پیش کی جا رہی ہے اس لیے کہ انھیں ایک ایسی بات کا خوف لاحق ہے جو اس سے بھی زیادہ گراں بار ہے وہ یہ کہ کہیں ان کے بشری جذبات انھیں ایک مومن کو قتل کرنے پر آمادہ کر کے جہنم میں نہ پہنچا دیں۔ یہ صدق و صفا کی حسین دہشت زدگی ہے در اصل وہ اپنے باپ کے معاملے میں لاحق ہونے والی بشری کمزوری کا مقابلہ کر رہے ہیں اسی لیے کہتے ہیں کہ "اہلِ خزرج جانتے ہیں کہ ان میں کوئی شخص مجھ سے بڑھ کر اپنے باپ سے محسن سلوک کرنے والا نہیں ہے"۔ اور اپنے قائد سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ اس کمزوری سے عہدہ برآ ہونے اور اس نقصان سے بچنے میں ان کی مدد کریں۔ لیکن اس سے ان کی یہ مراد نہیں کہ آپ اپنا حکم واپس لے لیں یا اسے بدل دیں اس لیے کہ آپ کا حکم تو ہر حالت میں قابلِ اطاعت ہے اور آپ کا فیصلہ بہر حال نافذ ہونا چاہیے بلکہ اس انداز میں کہ انھیں حکم دیا جائے کہ وہ خود اپنے باپ کا سر لا کر پیشِ خدمت کر دیں۔

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس اُلجھے ہوئے مومن نفس شخص کو دیکھتے ہیں تو بڑی فراخ دلی سے اور انتہائی کریمانہ انداز میں اس کی اُلجھن دُور فرما دیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے نہیں! جب تک وہ ہمارے ساتھ رہے گا ہم اس سے نرمی کا برتاؤ کریں گے اور حُسنِ سلوک سے کام لیں گے۔ اس سے پہلے آپ حضرت عمرؓ کو ان کے ارادے سے روک چکے تھے۔ حضرت عمرؓ سے آپ نے فرمایا تھا۔ عمرؓ! (غور کرو) اس اقدام کے بعد جب لوگ کہیں گے کہ حضرت محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کراتے ہیں تو کیا صورتِ حال ہوگی؟

پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ناخوشگوار صورتِ حال سے عہدہ برآ

ہونے کے لیے ایک عظیم قائد کی مانند انتہائی حکیمانہ تدبیر اختیار کی۔ پہلے تو ناوقت کُوچ کا حکم صادر فرما دیا اور سفر اس وقت تک جاری رکھا جب تک لوگ پُوری طرح تھک نہ گئے۔ تاکہ ان کی توجہ زمانۂ جاہلیت کی گندی عصبیت سے ہٹ جائے جسے دو نبرد آزما شخصوں کی نعرہ بازی نے بھڑکا دیا تھا۔ ایک پُکارا تھا کہ اے انصار تم کہاں ہو؟ اور دوسری طرف سے آواز بلند ہوئی تھی کہ مہاجرین مدد کو پہنچو! آپؐ نے یہ تدبیر اس لیے بھی اختیار فرمائی تاکہ مسلمانوں کو عبداللہ بن اُبیّ کے فتنے کی آگ سے بچا لیں جو اس نے اِس غرض سے بھڑکائی تھی کہ اس کے ذریعہ مہاجرین و انصار میں موجود تاریخِ مذاہب بلکہ تاریخِ انسانی کی بے مثال محبّت و اخوّت کو جلا کر بھسم کر دے۔

"بالآخر اس واقعہ کا آخری دل کش منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک مومنِ صادق عبداللہ بن ابی کے بیٹے حضرت عبداللہؓ تلوار سونت کر مدینہ کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور جب ان کا باپ آتا ہے تو اسے مدینہ میں داخل ہونے سے روک دیتے ہیں تاکہ خود اس کا قول کہ "عزّت والے لوگ ذلیل لوگوں کو مدینہ سے نکال دیں گے" اسی پر صادق آجائے اور اسے معلوم ہو جائے کہ عزّت مند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور ذلیل وہ خود ہے۔ اور عبداللہؓ اس وقت تک اپنے باپ کو روکے رکھتے ہیں تاآنکہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں اور اسے مدینہ میں داخل ہونے کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں اور عملی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ درحقیقت کون عزّت والا ہے اور کون ذلیل ہے۔

"خیال رہے یہ رفعت و بلندی کا وہ اُونچا مقام تھا جس تک ان لوگوں کو صرف ایمان نے پہنچایا تھا حالانکہ صحابہ کرامؓ بھی انسان ہی تھے ان میں انسانی کمزوریاں بھی تھیں اور انسانی وسوسے بھی۔ پھر بھی وہ اتنے بلند ہو گئے تھے۔

"اسلامی عقیدہ میں یہی وہ سب سے بڑا جمال اور بہت بڑی صداقت ہے اور جب

انسان کو اس حقیقت کا ادراک ہو جاتا ہے تو وہ خود اس جمال اور صداقت کی چلتی پھرتی اور کھاتی پیتی زندہ تصویر بن جاتا ہے۔"[۱]

حضرت انس بن مالکؓ بیان فرماتے ہیں:

"مَیں حضرت ابو طلحہ، ابو عبیدۃ بن الجراح، ابو دجانہ، معاذ بن جبل اور سہیل بن بیضاء رضوان اللہ علیہم کی ساقی گری کر رہا تھا اور شراب کے اثر سے ان حضرات کے سر ڈھلک چکے تھے کہ اچانک ایک اعلان سنائی دیا: "شراب حرام کر دی گئی ہے"!۔ انسؓ کہتے ہیں اس سے پہلے کہ کوئی ہمارے پاس آتا یا ہم میں سے کوئی باہر جاتا پہلا کام یہ کیا گیا کہ شراب بہا دی گئی اور مٹکے توڑ ڈالے گئے پھر ہم میں سے کچھ نے وضو کیا، کچھ نے غسل کیا اور اُمِّ سلیم کی خوشبو لگا کر مسجدِ نبوی کی طرف روانہ ہو گئے۔" (تفسیر ابن کثیر)

حضرت ابو بریدۃؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ ہم لوگ بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ مَیں اُٹھ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ اس وقت تک شراب حرام ہونے کا حکم آچکا تھا چنانچہ فوراً اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور انھیں حُرمتِ شراب کے حکم والی آیت: فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۹۱ المائدہ۔ "کیا تم باز آجاؤ گے۔" تک سنائی جس وقت میں نے یہ آیت سنائی کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں جام موجود تھے جن میں سے کچھ شراب پی جا چکی تھی اور کچھ باقی تھی۔ حکم سنتے ہی سب نے پیالے اُلٹا دیے، شراب پھینک دی اور صراحیاں بھی اوندھا دیں اور بہ تکرار کہتے جاتے تھے اِنْتَهَيْنَا رَبَّنَا! اِنْتَهَيْنَا رَبَّنَا! "اے ہمارے رب ہم باز آگئے۔" (ابنِ کثیر)

"نہ تو لوگوں کو ڈرانے کے لیے تنظیمیں قائم کرنی پڑیں اور نہ حکومت کو سزائے موت، قید یا املاک ضبط کرنے کا حکم دینا پڑا بلکہ لوگوں نے قرآن کا فیصلہ رضا کارانہ تسلیم کرتے ہوئے اس حکم کو بڑی خوشی اور فرمانبرداری سے خود پر نافذ کر لیا۔"[۲]

---

[۱] اقتباس از تفسیر "فی ظلال القرآن" جلد ۸ صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۴ – [۲] ماخوذ از "منہج القرآن فی التربیۃ" مصنفہ محمد شدید (مصنّف)

حضرت صفیہؓ بنت شیبہ روایت کرتی ہیں کہ :۔

ہم حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر تھیں کہ خواتینِ قریش اور ان کے فضل و کمال کی بات چھڑ گئی۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا بلاشبہ قریش کی عورتوں کو فضیلت حاصل ہے لیکن قسم بخدا میں نے انصار کی عورتوں سے زیادہ فضیلت والی، قرآن مجید کی تصدیق کرنے اور اس پر ایمان لانے والی خواتین نہیں دیکھیں۔ جب سُورۂ نُور کی یہ آیت :

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (النور ۳۱) "اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں"۔ نازل ہُوئی تو ان کے مَردوں نے جا کر انھیں یہ آیت جو اُن کے متعلق تھی سنائی۔ ہر شخص اپنی بیوی، بیٹی، بہن اور رشتہ دار خواتین کو سناتا تھا اور سُنتے ہی ہر خاتون اٹھتی تھی اور حکمِ قرآنی کی تعمیل و تصدیق کے لیے چادر سے اپنا سر ڈھانپ لیتی تھی (یہ روایت ابوداؤد نے بیان کی ہے)

"مُشرکینِ مکّہ نے کچھ مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کے لیے قید کر دیا تھا یا بیڑیوں میں جکڑ دیا تھا اور انھیں اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے سخت سزائیں دیتے تھے۔ جب معاہدۂ حدیبیہ ہُوا تو اس میں طے پایا کہ اگر کوئی شخص کافروں سے بھاگ کر مکّہ سے مدینے جائے گا تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے مکّہ واپس لوٹا دیں گے۔ معاہدے کے بعد ابوبصیرؓ (عتبہ بن اُسید) کسی طرح قید سے فرار ہو کر سات دن پاپیادہ چل کر مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ چنانچہ مشرکوں نے بھی اپنے دو آدمی ان کے پیچھے روانہ کیے تاکہ معاہدۂ حدیبیہ کے مطابق انھیں لوٹا لائیں۔ مُسلمانوں کے لیے یہ ایک انتہائی کٹھن مرحلہ تھا۔ کہ ایک مسلمان نوجوان کو مُشرکوں کے حوالے کر دیں تاکہ وہ اسے مزید سزا دیں جبکہ پہلے بھی وہ ان کا عذاب برداشت کرتا رہا ہے اور سخت جد و جہد اور مُشقّت کے بعد مدینہ پہنچا ہے۔ ابوبصیرؓ کا خیال بھی یہی تھا کہ اب وہ مُصیبت اور عذاب سے نجات پا گئے ہیں اور ان کے وہم و گمان میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم انھیں دشمنوں

کے سپُرد کر دیں گے اسی بنا پر جب آپؐ نے واپس چلے جانے کا حکم دیا اور انھیں قریش کے کارندوں کے سپُرد کیا تو وہ کہنے لگا یا رسول اللہ کیا آپؐ مجھے مُشرکوں کے سپُرد کر رہے تاکہ وہ میرے مسلمان ہو جانے کی وجہ سے مجھ پر مصیبتیں توڑیں؟ اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابوبصیرؓ! تمھیں اُس معاہدے کا تو علم ہے جو ہم مشرکین سے کر چکے ہیں اور ہمارے دین میں وعدہ خلافی جائز نہیں ہے۔ یقیناً اللہ تعالٰے تمھارے لیے اور تمھارے ساتھی مسلمانوں کے لیے خلاصی کی کوئی نہ کوئی راہ ضرور پیدا کرے گا۔ ابوبصیرؓ نے حیرت سے کہا یا رسولؐ اللہ کیا آپ مجھے مشرکوں کے حوالے کریں گے؟ آپؐ نے اس پر پھر فرمایا۔ ابوبصیر چلے جاؤ اللہ تعالٰے تمھارے لیے نجات کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کریگا اور انھیں قریش کے سفیروں کے سپُرد کر دیا۔"[1]

اہلِ کوفہ میں سے ایک شخص نے حضرت حذیفہؓ بن یمانؓ سے دریافت کیا۔ اے ابوعبداللہ کیا آپ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور آپؐ کی صحبت کا شرف حاصل کیا ہے۔ حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا "ہاں بھتیجے"۔ اس نے پوچھا آپ لوگ (آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ) کیا طرز و روش اختیار کیا کرتے تھے؟ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا: ہم (راہِ خدا میں) جِدّ و جُہد کیا کرتے تھے۔ یہ سن کر وہ شخص کہنے لگا کہ ہم اس زمانے میں ہوتے تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زمین پر نہ چلنے دیتے بلکہ آپؐ کو کاندھوں پر اٹھائے پھرتے۔ اس بات پر حضرت حذیفہؓ نے کہا، بھتیجے کاش تم نے ہمیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ خندق کے دن دیکھا ہوتا، آپؐ رات گئے تک نماز میں مصروف رہے۔ پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا۔ کوئی شخص ہے جو جا کر دیکھے اور واپس آ کر اطلاع دے کہ اس وقت دشمن کا کیا حال ہے؟ (گویا آپؐ نے جا کر واپس آنے کی شرط لگا دی تھی) آپؐ نے فرمایا

[1] اقتباس از کتاب منہج القرآن فی التربیہ۔ تصنیف علامہ محمد شدید۔ (مصنف)

جو شخص یہ کام کرے گا میں اس کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرونگا کہ وہ جنت میں میرا ساتھی ہو۔ لیکن شدید خوف، بھوک کی زیادتی اور سخت سردی کی وجہ سے کوئی شخص اس کام کے لیے تیار نہ ہُوا۔ جب کوئی شخص نہ اٹھا تو آپؐ نے مجھے یاد فرمایا۔ چونکہ آپؐ نے بطورِ خاص مجھے یاد فرمایا تھا اس لیے حاضرِ خدمت ہُوئے بنا چارہ نہ تھا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ حذیفہ جاؤ اور دشمنوں کے اندر گھُس کر دیکھو۔ وہ اس وقت کیا کر رہے ہیں۔ اور کوئی حرکت نہ کر گزرنا تاکہ تم واپس ہمارے پاس آسکو۔ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں جا کر دشمنوں میں گھُس گیا اور دیکھا کہ آندھی اور خدائی فوج نے دشمنوں کا حلیہ بگاڑ رکھا ہے نہ ان کا کوئی برتن ٹھکانے پر ہے نہ آگ جل سکتی ہے اور نہ خیمے کھڑے رہ سکتے ہیں۔ اسی وقت ابوسفیان (قریش کا سپہ سالار) کھڑا ہُوا اور کہنے لگا۔ اے قریش کے لوگو! ہر شخص اپنے ساتھی کی طرف سے چوکنا رہے ۔۔۔۔ پھر کہنے لگا۔ اے اہلِ قریش! اب رُکنے کی کوئی صُورت نہیں ہے۔ ہمارے گھوڑے اور اُونٹ ہلاک ہو گئے ہیں، بنی قریظہ نے مدد کرنے کا وعدہ پُورا نہیں کیا بلکہ ہمیں ان کے متعلق سخت ناپسندیدہ اطلاعات ملی ہیں، اُدھر سخت آندھی کے باعث جو حال ہو رہا ہے وہ تم سب دیکھ رہے ہو، نہ کوئی برتن ٹکتا ہے نہ آگ جلتی ہے اور نہ کوئی خیمہ کھڑا رہتا ہے۔ اس لیے اب یہاں سے چل پڑو اور میں جا رہا ہوں ۔۔۔۔ حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ یہ حالات دیکھ کر جب میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا تو آپؐ اپنی کسی زوجہ مطہرہ محترمہؓ کی یمنی چادر اوڑھے نماز پڑھ رہے تھے مجھے دیکھتے ہی آپؐ نے مجھے اپنے قدموں میں بٹھا لیا اور چادر کا کنارہ مجھے اوڑھا دیا۔ پھر آپؐ نے اس حالت میں رکوع و سجود فرمایا کہ میں آپؐ کی چادر کا کنارہ اوڑھے ہُوئے تھا۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا تو میں نے تمام واقعات آپؐ کی خدمت میں عرض کر دیے۔ جب بنو غطفان کو (جو قریش کی مدد کو آ رہے تھے) ان حالات کی اطلاع ملی تو وہ بھی راستے میں سے ہی واپس اپنے علاقے کی طرف لَوٹ گئے۔

واقعہ خندق میں مسلمانوں کو جس عظیم خوف و دہشت سے دوچار ہونا پڑا تھا، جتنی بڑی مصیبت و تکلیف ان کو برداشت کرنا پڑی تھی اور اس کی شدت کے اثر سے جو پریشانی اور گھبراہٹ ان پر طاری تھی اس کی تصویر قرآن مجید نے ان الفاظ میں کھینچی ہے: هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ۝ الاحزاب "اس وقت ایمان والے خُوب آزمائے گئے اور بُری طرح ہلا مارے گئے۔"

یہ لوگ (صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم) بھی انسان تھے اور انسانی طاقت کی ایک حد ہے اور اس حد سے زیادہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں انھیں بالآخر اللہ تعالےٰ کی طرف سے مدد پہنچنے کا یقین کامل بھی تھا۔ اس پر مستزاد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بشارتیں تھیں جو ان تمام حالات سے صرف نظر کرتے ہُوئے آپؐ نے مسلمانوں کو یمن، شام اور مشرق و مغرب کی فتح کے بارے میں اس موقع پر دی تھیں۔ ان سب باتوں کے باوجود وہ ہولناک کیفیت جس سے وہ اس وقت دوچار تھے انھیں متزلزل اور بے چین کیے دے رہی تھی اور ان کے دل رنجیدہ تھے۔

"اس صورتِ حال کی مکمل ترین تصویر حضرت حذیفہؓ کے بیان میں نظر آتی ہے گویا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کی حالت کو پوری طرح محسوس کر رہے تھے اور ان کی دلی کیفیات سے بخوبی باخبر تھے اسی لیے آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ کوئی شخص ہے جو اس وقت دشمن کے حالات جا کر دیکھے اور واپس آکر اطلاع دے گویا ایک تو آپؐ واپس آکر اطلاع دینے کی شرط عاید فرماتے ہیں دُوسرے یہ کارنامہ سرانجام دینے والے کے لیے جنت میں اپنی رفاقت کی دُعا بھی فرماتے ہیں۔ اس کے باوجود کوئی شخص تیار نہیں ہوتا۔ بالآخر جب حضرت حذیفہؓ کو بطورِ خاص ان کا نام لے کر یاد فرماتے ہیں تو جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے کہ "اب میرے لیے بجاآوریِ حکم کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہیں تھا۔" آپ خود محسوس کر سکتے ہیں کہ یہ صورتِ حال صرف انتہائی نازک

اور قدم اکھاڑ دینے والے مواقع پر بھی پیش آسکتی ہے۔

لیکن اس تمام لڑکھڑا دینے والی خیرہ کن اور دل شکن صورت حالات میں بھی ان حضرات کا اللہ سے جو رابطہ تھا وہ منقطع نہیں ہوا تھا اور وہ شعور زندہ تھا جو سنت اللہ کے سلسلے میں گمراہ نہیں ہونے دیتا اور قوانین الٰہی کے حتمی اور یقینی ہونے پر اعتماد کو ڈگمگانے نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ایمان تھا کہ جب سُنّت اللہ کا ایک حصہ عملاً سامنے آگیا ہے تو یقیناً اس کا وہ انجام بھی بالآخر وقوع پذیر ہو کر حقیقت بنے گا جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اور اسی بنا پر ان کے دل میں پوری طرح یہ یقین موجود تھا کہ یہ کربناک صورت حال بالآخر فتح و کامرانی کا سبب بنے گی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو سچ کر دکھایا تھا کہ: اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ ۝ البقرہ ۲۱۴

"پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یُوں ہی جنت کا داخلہ تم کو مل جائے گا، حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اس وقت انھیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔" دراصل یہی (صحابہ کرامؓ ہی) وہ لوگ تھے جو ہلا مارے گئے تھے اور اسی وجہ سے اللہ کی مدد بھی انھیں فوراً پہنچ گئی جس پر وہ پکار اٹھے: هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ۝ الاحزاب ۲۲

"کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا، اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔" گویا ہم سے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی وعدہ کیا تھا کہ یہ ہولناک

دہشت، یہ تکلیف و کرب، یہ پاؤں اکھاڑ دینے والی مصیبت اور تنگی برداشت کر لینے اور سہہ جانے کا نتیجہ اللہ تعالےٰ کی مدد کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اس لیے ضروری ہے کہ اب اللہ کی مدد پہنچے۔ اور "صدق اللہ ورسولہ" کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ اور رسولؐ نے جو علامات بتائی تھیں وہ سچی تھیں اور پھر ان کے بتائے ہُوئے نتائج (مدد) بھی سچ ثابت ہوگئے۔ بنابریں ان کے دل اللہ کی مدد اور اس کے وعدے پر پوری طرح مطمئن ہوگئے "وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا" سے یہی کیفیت مُراد ہے۔

صحابہ کرامؓ بھی آخر انسان تھے اور یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ انسانی کمزوریوں اور انسانی جذبات و کیفیات سے خالی نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ان سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ حدودِ بشری سے تجاوز کر جائیں یا جنسِ انسان کے لیے جو دائرہ مقرر ہے اسے پھلانگ کر انسانی خصوصیات اور ممیزات کھو بیٹھیں۔ کیونکہ انسانیت ہی ان کا مقصدِ تخلیق تھا۔ اللہ نے انھیں اسی لیے پیدا فرمایا تھا کہ انسان رہیں (اور انسان رہتے ہُوئے وہ سب کچھ کر دکھائیں جو انھوں نے کیا) انھیں فرشتہ، جن، حیوان یا پتھر نہیں بنایا تھا چنانچہ وہ بشریت کے ناطے خوف زدہ بھی ہو جاتے تھے اور مصیبت کے وقت دل تنگی بھی محسوس کرتے تھے اور ایسے خطرات کے مواقع پر جو بشری طاقتِ برداشت سے زائد ہوں ڈگمگا بھی جاتے تھے لیکن ان سب کمزوریوں کے باوجود ان کا اللہ سے انتہائی مضبوط رشتہ استوار تھا جو انھیں معیار سے گرنے نہ دیتا تھا اور تجدیدِ آرزو کے ذریعہ انھیں مایُوسی سے محفوظ رکھتا تھا۔ اور اس طرح یہ لوگ تاریخ انسانی کے ایسے بے مثال افراد بن گئے جن کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی۔

ہمارے لیے ضروری ہے کہ ان سب باتوں کا ادراک حاصل کریں تاکہ تاریخِ روزگار کے ان بے مثل نمونوں کو سمجھ سکیں۔ لازم ہے کہ ہم یہ بات سمجھیں کہ یہ لوگ بھی انسان تھے اور انسانی فطرت کی کمزوریوں اور خوبیوں سے بالاتر نہ تھے دراصل ان کا امتیازِ خصوصی

یہ تھا کہ انسان ہوتے ہوئے انھوں نے انسانیت کے اس بلند ترین مقام کو حاصل کر لیا تھا جہاں انسان بشریت کی زمینی خصوصیات کو باقی رکھتے ہوئے عظمت کے آسمان کو چھو لیتا ہے۔

حضرت بریدہ رضؓ سے روایت ہے کہ حضرت ماعز بن مالکؓ اسلمی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہؐ مجھے پاک کر دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا اے نادان شخص جاؤ اور اللہ سے توبہ و استغفار کرو۔ چنانچہ وہ واپس چلے گئے مگر تھوڑی دُور جا کر پھر واپس آ گئے اور دوبارہ عرض کیا یا رسول اللہؐ مجھے پاک کر دیجیے۔ آپؐ نے پھر حسبِ سابق جواب دیا۔ حتیٰ کہ جب چوتھی بار لوٹ کر آئے تو آنجنابؐ نے دریافت فرمایا تم نے کیا کیا ہے جس سے میں تمھیں پاک کر دوں ؛ حضرت ماعزؓ نے عرض کیا۔ زنا ! ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کیا یہ شخص دیوانہ ہے ؟ لوگوں نے عرض کیا نہیں دیوانہ نہیں ہے۔ پھر آپؐ نے دریافت فرمایا کیا شراب کے نشہ میں ہے ؟ اس پر ایک شخص نے اُٹھ کر ان کا مُنہ سونگھا لیکن شراب کی بُو نہیں آئی۔ اب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ماعزؓ سے دریافت فرمایا کیا واقعی تم نے زنا کیا ہے ؛ ماعزؓ نے عرض کیا جی ہاں۔ اس اعتراف پر آپؐ نے رجم کا حکم صادر فرما دیا۔ اس واقعہ کے دو یا تین دن بعد آپؐ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ ماعزؓ کے لیے دُعائے مغفرت کرو۔ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ یہ توبہ اگر ایک امت پر تقسیم کی جائے تو سب کے لیے کافی ہو۔

اسی طرح قبیلہ "ازد" کی شاخ "غامد" کی ایک عورت آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہؐ مجھے پاک کر دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا۔ پگلی جا اور جا کر اللہ سے توبہ و استغفار کر۔ کہنے لگی کیا آپؐ مجھے اُسی طرح واپس لوٹا دینا چاہتے ہیں جس طرح آپؐ نے ماعز بن مالکؓ کو لوٹا دیا تھا ؛ واقعہ یہ ہے کہ میں زنا سے حاملہ ہوں۔ آپؐ نے استفسار فرمایا۔ "تو"۔ اس نے کہا "جی ہاں میں"! آپؐ نے فرمایا (اگر یہ بات ہے تو تم پر حد نافذ ہو گی) مگر بچہ کی ولادت کے بعد۔ بریدہؓ کہتے ہیں کہ ایک انصاری

صحابیؓ نے اس عورت کی کفالت اپنے ذمہ لے لی حتیٰ کہ اس کے بچہ پیدا ہو گیا۔ اور انصاری نے آ کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ غامدیہ کے بچہ ہو گیا ہے آپؐ نے فرمایا کہ ابھی اسے "رجم" نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس کا بچہ چھوٹا ہے اسے دُودھ کون پلائے گا۔ انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا کہ بچے کی رضاعت کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ چنانچہ اس عورت پر حدِ رجم جاری کر دی گئی۔ ایک دُوسری روایت میں اس طرح ہے کہ آپؐ نے فرمایا تھا کہ اس وقت چلی جاؤ اور جب بچہ ہو جائے تو آنا۔ چنانچہ جب بچہ پیدا ہو گیا تو وہ پھر حاضر ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا کہ ابھی نہیں جب اس کا دُودھ چھوٹ جائے گا تب آنا۔ پھر جب بچے کا دُودھ بھی چھوٹ گیا اور وہ عورت بچہ کو لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا اور کہنے لگی یا رسول اللہؐ میں نے اس کا دُودھ چھڑا دیا ہے اور اب یہ روٹی کھانے لگا ہے چنانچہ آپ نے بچہ ایک صحابی کے سپرد کر دیا اور اس کے سلسلے میں حکم دیا کہ اتنا گہرا گڑھا کھودا جائے جس میں یہ عورت سینے تک سما جائے اور سنگسار کر دیا جائے۔ جس وقت اسے رجم کیا جا رہا تھا حضرت خالدؓ بن ولید نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر پتھر مارا تو خون کے چھینٹے اُڑ کر حضرت خالدؓ کے منہ پر پڑے اور آپ نے اسے کوسا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالدؓ کو منع کیا اور فرمایا۔ خالد ! رک جاؤ۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر کسی محصُول وصول کرنے والے (دلال) نے کی ہوتی تو اس کی بھی مغفرت ہو جاتی۔ پھر آپؐ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا حکم دیا اور دفن کر دیا گیا۔

"روایت ہے کہ حضرت یُونس بن عبیدؒ کی دکان میں مختلف اقسام کے ملبوسات تھے جن کی قیمتیں دو سو روپے سے چار سو روپے تک تھیں۔ ایک دفعہ یُونسؒ

دکان پر اپنے بھتیجے کو بٹھا کر نماز کے لیے گئے اسی اثنا میں ایک اعرابی آیا اور اس نے چار سو روپے والا لباس طلب کیا، بھتیجے نے دو سو روپے والا لباس دکھایا جو اعرابی کو پسند آگیا اور اس نے بخوشی وہی لباس (چار سو میں) خرید لیا۔ ابھی وہ اعرابی لباس خرید کر نکلا ہی تھا کہ راستے میں حضرت یونس بن عبیدؒ مل گئے اور انھوں نے اپنی دکان کا جوڑا پہچان کر قیمتِ خرید دریافت کی۔ اعرابی نے بتایا کہ چار سو میں لیا ہے۔ آپ نے کہا دو سو سے زیادہ کا نہیں ہے اسے جا کر واپس کر دو۔ دیہاتی نے جواب دیا کہ ہمارے علاقے میں تو یہ پانچ سو کا ہے اور پھر میں نے یہ اپنی پسند سے خریدا ہے آپ نے فرمایا۔ میرے ساتھ دکان میں چلو، ہمارے دین میں دوسرے کی خیر خواہی دنیا اور دنیا کی ساری مال و دولت سے بہتر ہے۔ پھر اسے اپنے ساتھ دکان پر لائے اور دو سو روپے اسے واپس کر دیے۔ اور اپنے بھتیجے کو ڈانٹا کہ تمہیں اتنا زیادہ منافع لیتے ہوئے شرم نہ آئی اور نہ اللہ سے ڈرے۔ بھتیجے نے جواب دیا کہ اس نے خوشی سے خریدا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ (بھول گئے) حدیثِ نبوی اَلْمُسْلِمُ یُحِبُّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ، تم نے اس کے لیے بھی وہی کچھ کیوں نہ پسند کیا جو اپنے لیے پسند کرتے ہو۔[1]

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ۝۲۸ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝۲۹ الاحزاب ۳۳ "اے نبی، اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔"

۱؎ اقتباس از "الرسالة الخالدة" تصنیف استاد عبد الرحمٰن عزامؒ (مصنف)

اس آیۂ کریمہ کا شانِ نزول یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور اپنے اہلِ بیت کیلیے ایسی معیشت پسند فرمائی تھی جس سے محض گزارہ ہوتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپؐ خوش حالی اور عیش و عشرت کی زندگی کے ذرائع حاصل نہ کرسکتے۔ بلکہ یہ طرزِ زندگی آپؐ نے اللہ کی طرف سے آخرت میں ملنے والی نعمتوں کی طلب میں اور دنیا اور متاعِ دنیا سے بے نیاز اور بلند رہنے کی خاطر اختیار فرمایا تھا۔ اس لیے کہ آپؐ کی حیات مبارک میں ہی سرزمینِ عرب کے بہت سے علاقے فتح ہو گئے تھے جہاں سے کثیر مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا اور محصولات کی آمدنی بھی وافر تھی جس کے نتیجہ میں ایسے لوگ بھی جو پہلے بے زر و قلاش تھے مال دار ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ کا معمولِ حیات یہ تھا کہ آپؐ کے گھر میں مہینہ مہینہ آگ نہیں جلتی تھی اور دوسروں پر جود و سخا کی بارش تھی۔ ہمیشہ صدقات، تحفے اور انعامات عطا فرماتے رہتے تھے۔ اپنی ذات اور اپنے اہلِ خانہ کے لیے ایسا اندازِ زندگی اختیار کرنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ آپ اپنے عقیدے یا شرعی احکام کی بنا پر اس کے پابند تھے۔ کیونکہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے تمام پاک چیزیں حلال ہیں۔ اور حلال و طیب چیزوں کو آپؐ نے اپنے لیے حرام کیا بھی نہیں تھا بشرطیکہ وہ بلا طلب و جستجو، پیچھے بھاگے بغیر اور ان کے حصول میں منہمک ہوئے بغیر از خود اور بے ساختہ آپؐ کے سامنے آجائیں یا اچانک اور اتفاقاً مل جائیں۔ نہ آپؐ نے اپنی اُمت کو اس بات کا پابند بنایا ہے کہ سب لوگ ویسی ہی (عسرت کی) زندگی اختیار کریں جیسی آپؐ نے اپنے لیے پسند فرمائی تھی اِلّا یہ کہ کوئی شخص دُنیاوی لذتوں اور آسائشوں سے بالاتر ہونے اور خواہشاتِ نفس سے مکمل چھٹکارا پانے کے لیے ان کا بوجھ اپنی خوشی سے اُتار پھینکے۔ لیکن آپؐ کی ازواجِ مطہرات بہرحال عورتیں تھیں، انسان تھیں اور ان کے بھی انسانوں جیسے جذبات و خواہشات تھے۔ اپنی تمام تر فضیلت و عظمت اور سرچشمۂ نبوت سے قریب ہونے کے باوجود دنیوی راحت و آسائش کی فطری

رغبت ان کے دلوں میں ابھی موجود تھی چنانچہ انھوں نے جب دیکھا کہ نبی کریمؐ اور مسلمانوں پر اللہ کے احسان اور کرم نوازی سے اس وقت معاشرے میں فراخی و خوش حالی آگئی ہے تو انھوں نے بھی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نان نفقہ میں اضافہ کی درخواست کی. لیکن آپؐ نے اس درخواست کو پسند نہ فرمایا بلکہ اس پر افسوس اور ناخوشی ظاہر فرمائی۔ اس لیے کہ آپؐ چاہتے تھے کہ جو بے نیازی، رفعت اور رضائے الٰہی پر راضی رہنے اور دنیوی فوائد و منافع سے استغنا کی زندگی آپؐ نے اپنے لیے پسند فرما رکھی ہے ازواجِ مطہراتؓ بھی ویسی ہی زندگی اختیار کریں اور آپؐ اور آپؐ کی پناہ میں رہنے والے افراد کی زندگی بھی اسی روشن اور بلند افق کے مطابق ہو اور دنیا اور دنیاوی کھوٹ کی آمیزش سے ہر طرح پاک و صاف ہو۔ ایسا انداز اختیار کرنے سے آپؐ کی مُراد یہ نہیں تھی کہ آسائشِ زندگی کے ذرائع کا تعلق مسائلِ حرام حلال سے ہے اس لیے کہ حرام و حلال تو واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ ازواجِ مطہرات دنیا کے پست میلانات و رجحانات سے مکمل طور پر آزاد، بے نیاز اور دور رہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ازواجِ مطہرات کی طرف سے نان و نفقہ میں اضافہ کے مطالبے سے اس قدر رنج اور صدمہ ہوا کہ آپؐ نے کچھ عرصہ کے لیے صحابہ کرامؓ سے ملاقات ترک فرما دی. اور یہ بات صحابہ کرام کے لیے دنیا کی تمام مصیبتوں سے بڑھ کر تھی. صحابہ کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے لیکن اذنِ باریابی نہ ملتا. امام احمدؒ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف فرما تھے اور صحابہ کرامؓ باہر دروازے پر جمع تھے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور آپؐ سے باریابی کی اجازت طلب کی لیکن آپ کو اجازت نہ ملی. پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے انھوں نے بھی حاضری کی اجازت چاہی لیکن ان کو بھی اجازت نہ ملی. لیکن کچھ دیر کے بعد آپؐ نے حضرت صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کو اندر آنے کی اجازت مرحمت فرمائی. جس وقت یہ دونوں حضراتؓ اندر داخل ہوئے آپؐ تشریف فرما تھے اور آپؐ کے گرد ازواجِ مطہراتؓ حلقہ بنائے بیٹھی

تھیں اور آپؐ خاموش تھے. حضرت عمرؓ نے خیال ظاہر کیا کہ پہلے میں آپؐ سے بات کرتا ہوں شاید آپؐ میری بات پر تبسم فرمائیں چنانچہ حضرت عمرؓ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ اگر زید کی بیٹی (حضرت عمرؓ کی زوجہ محترمہؓ) مجھ سے نفقہ کا مطالبہ کرے تو میں اس کی گردن توڑ دوں. یہ بات سُن کر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکرانے لگے کہ آپؐ کے سامنے کے دندانِ مُبارک نظر آگئے۔ اور فرمایا یہ سب جو میرے گرد بیٹھی ہیں نفقہ ہی مانگ رہی ہیں۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف اور حضرت عمرؓ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف مارنے کے لیے بڑھے اور کہنے لگے تم آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی چیز کا مطالبہ کیوں کرتی ہو جو آپ کے پاس نہیں ہے؟ لیکن آپؐ نے ان دونوں کو مارنے سے منع فرما دیا. چنانچہ دونوں ازواجِ مطہراتؓ کہنے لگیں آج کے بعد ہم آپؐ سے کبھی کوئی ایسی چیز نہ طلب کریں گی جو آپؐ کے پاس نہ ہو. حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جب (اسی واقعہ کے سلسلے میں) اللہ تعالیٰ نے آیتِ "خیار" نازل فرمائی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے بات کی. آپؐ نے فرمایا: "تم سے ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں جس کے سلسلے میں میری خواہش ہے کہ تم اپنے والدین سے مشورہ کیے بغیر جلد بازی سے کوئی فیصلہ نہ کرنا." حضرت عائشہؓ نے عرض کیا، کیا بات ہے؟ تو آپؐ نے اُن کے سامنے آیت: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ الخ تلاوت فرمائی. حضرت عائشہؓ نے عرض کیا، کیا میں آپؐ کی ذات کے بارے میں اپنے والدین سے مشورہ کروں؟ نہیں! میں اسی وقت فیصلہ کرتی ہوں کہ میں اللہ اور اللہ کے رسُولؐ کا انتخاب کرتی ہوں لیکن میری درخواست ہے کہ اپنی ازواجِ مطہرات میں سے کسی کو نہ بتایئے گا کہ میں نے کیا انتخاب کیا ہے. اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی کو سختی میں ڈالنے والا بنا کر نہیں بھیجا بلکہ میں تو تعلیم دینے اور سہولت پیدا

کرنے کے لیے مبعوث ہُوا ہُوں۔ مجھ سے ازواجِ مطہراتؓ میں سے جو بھی تمھارے فیصلے کے متعلق دریافت کرے گی میں اسے صحیح بات بتا دوں گا۔"

"بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کچھ دیر رُک کر اس واقعے کے بعض پہلوؤں پر غور کر لیا جائے۔ ایک طرف یہ واقعہ اقدارِ حیات کے بارے میں اسلام کے واضح تصوّر کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اور دنیا اور آخرت کو محسوس کرنے کے سلسلے میں شعوری طریق کار متعین کرتا ہے۔ گویا مسلمان کے دل سے دُنیا اور آخرت کی قدروں میں سے کسی ایک کی اقدار کو ترجیح دینے اور زمین یا آسمان میں سے کسی ایک کی طرف مائل ہونے کے سلسلے میں ہر قسم کے تذبذب اور کشمکش کو دُور کر دیتا ہے اور مومن کے دل کو ہر اس اجنبی لگاوٹ سے پاک کر دیتا ہے جو اس کے صرف اللہ سے لو لگانے اور اللہ کا ہو رہنے میں حائل ہوتی ہے۔ یہ تو اس واقعہ کا ایک پہلو ہے دُوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ واقعہ ہمارے سامنے اس حقیقی زندگی کی منظر کشی کرتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے متعلقین بسر کرتے تھے۔ اس حقیقت کا سب سے خوبصورت گوشہ یہ ہے کہ یہ زندگی انسانی زندگی تھی، ایسے انسانوں کی زندگی جو اپنی بے مثال رفعت اور لازوال عظمت کے باوجود بشریت اور بشری جذبات سے عاری نہیں ہُوئے تھے بلکہ ان کے بشری جذبات و عواطف عام سطح سے بلند ہو کر ہر قسم کی آلائش سے پاک ہو گئے تھے اور صرف فطرتِ انسانی کا ایک ایسا حسین امتزاج باقی رہ گیا تھا جو کمال کے اُن بلندترین مدارج تک پہنچنے میں جو انسان کا مقدر ہیں مانع نہیں ہوتا۔"[1]

مندرجہ بالا مختلف مثالیں جن میں ایک طرف بے مثل شہ زوری نظر آتی ہے اور دُوسری طرف انسان کو لاحق ہونے والے ضعف کے پہلو بھی موجود ہیں، ہمارے سامنے دُورِ اوّل کے اس مسلم معاشرے کی پُوری تصویر پیش کرتے ہیں جو اسلام کے صحیح مفہوم کے زیرِ سایہ زندگی بسر کرتا تھا، جس میں لوگوں نے دین کے تقاضوں کو حقیقی معنی میں پُوری طرح

[1] از۔ فی ظلال القرآن جلد ۲۱۔ صفحہ ۶ - ۸

اپنا لیا تھا۔ ان لوگوں کو ایمان کے مفہوم کا بھی پُورا پُورا ادراک تھا اور ان ذمّہ داریوں کو بھی بخوبی سمجھتے تھے جو ——— ایک صحیح انسان ہونے کی بنا پر ان کے کندھوں پر تھیں۔

بات دراصل اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام محض اس مقصد سے کہ اللہ کے بندوں پر حکومت کی جا سکے ان پر چند فرائض عاید کر دیتا ہے۔ بلکہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے مسئلہ کی نوعیت یہ ہے کہ اگر انسان حقیقی معنی میں انسان بننا چاہتا ہے تو اس کے تقاضے کیا ہیں۔ انسان محض ایک کھانے پینے والا وجود نہیں ہے جو اس زمین پر اتفاقات کے زیرِ اثر اور لمحاتی خواہشات و میلانات کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارے نہ تو آئینِ فطرت اور قوانینِ طبعیہ کی قدر و قیمت پہچانے اور نہ اس کائنات میں انسان کے منفرد و ممتاز مقام یعنی اپنے "خلیفۃ اللہ" ہونے کا ادراک حاصل کرے۔

دُورِ اوّل کے مسلمانوں کے نزدیک جنھوں نے اسلام کے زیرِ سایہ زندگی گزاری تھی ایک حقیقی اور صحیح انسان کو جانچنے کا یہی پیمانہ تھا جو انھوں نے قرآن و سنّت سے اخذ کیا تھا۔ اور حقیقتاً اسی پیمانے کے مطابق اپنی زندگی کو استوار کر کے یہ ثابت کر دکھایا تھا کہ فی الواقع انہی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ زمین کی غالب قوت بن کر اس پر حکومت کریں اور انسانیت پر تسلّط حاصل کر کے اسے صحیح راستہ پر چلائیں۔

اسلام درحقیقت نام ہے انسان کو اس کا صحیح مقام دلانے کا۔ اور انسان کو اس کی ان قوتوں اور صلاحیتوں سے متعارف کرانے کا جو اس کے اندر موجود ہیں، پھر ان قوتوں اور صلاحیتوں کو ان کی حیثیت اور تناسب باہمی کے اعتبار سے ان کے صحیح مقام پر مرتب و منظم کر کے انھیں پُوری طرح ایسے عمل میں استعمال کرنے کا جو کائنات کے قوانینِ طبعیہ کے مطابق ہو تاکہ وہ اپنی حقیقی شکل و صُورت اختیار کر سکیں، صرف حقیر اور محدود مادی قوت بن کر نہ رہ جائیں بلکہ ایسی آفاقی قوت بنیں جو اللہ کے بنائے ہُوئے ناموسِ اکبر سے ہدایت حاصل کر کے اس کائنات کی مؤثر و فعال قوت ثابت ہو۔

اسی طرح انسان سے وہ معجز نما کام ظہور پذیر ہو سکتے ہیں جو اس مسلم معاشرے میں ظاہر ہوئے جس کے کچھ نمونے ہم نے پیش کیے ہیں اور جس کے متعلق تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ دنیا میں انسانی زندگی کو عدل وانصاف کی بنیادوں پر استوار کرنے کی یہ عظیم ترین کوشش تھی اور انسانی زندگی کو مادی، رُوحانی، اجتماعی، اقتصادی، علمی اور عملی الغرض تمام پہلوؤں .. میں انسانیت کے لیے پاکیزہ معیار کے مطابق پروان چڑھانے کا ایک بہترین اور عظیم تر اقدام تھا جس میں "خیر" (فوائد ومنافع) انانیت اور خود پسندی کے جذبے کے ماتحت سمٹ کر صرف چند لوگوں میں جمع نہیں ہو گئی تھی بلکہ سب کے لیے عام تھی حتٰے کہ "خیر" میں سے ان لوگوں کو بھی پورا پورا حصہ ملتا تھا جو اس دین پر ایمان نہیں رکھتے تھے بلکہ اس سے اُن صلیبیوں نے بھی استفادہ کیا جو برسرِ پیکار تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایمان کی یہ شاہکار تصویر اور انسانی ممکنات کا یہ مثالی مرقع جس میں انسان کو اس کے انسانی وجود کی مناسبت سے انسان کے صحیح اور اصلی مقام پر رکھنے کی اعلیٰ ترین منظر کشی تھی جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے فکر وعمل اور شعور کی قوتوں کو تمام جہتوں اور میدانوں میں پھلنے پھُولنے اور کار فرما ہونے کے اعلیٰ ترین مواقع مہیا کیے جائیں اور انسانی وجود کی یہ پاکیزہ ترین تصویر جس میں انسان نے اپنی تمام تر بلندی کے باوجود دائرہ بشریت میں رہتے ہوئے اور اپنی بشریت کا تحفظ کرتے ہوئے انسانیت کی افضل ترین خصوصیات حاصل کر لی تھیں۔ یہ مثالی معاشرہ کس طرح راہ راست سے بھٹک گیا؟۔

آخر اسلام سے انحراف کی موجودہ ناگفتہ بہ حالت جس میں مسلمان آج مُبتلا ہے کس طرح پیدا ہو گئی اور مسلمان کے ذہن میں اسلام کا مفہوم سکڑ سمٹ کر اتنا حقیر کیسے رہ گیا؟ کہ جہاں اب یہ مفہوم اپنی بہترین شکل وصورت میں نظر آتا ہے صرف اتنا سمجھا جاتا ہے، کہ مخلصانہ انداز میں چند مظاہرِ عبادات ادا کر لینا کافی ہے اور اکثر حالات میں یہ ادائیگی بھی

عملاً نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی عبادت کے لیے "حُسنِ نیت" تک محدود رہتی ہے۔ اور بدترین صورت۔ اس کی تو کوئی انتہا ہی نہیں ہے جہاں علیٰ الاعلان دین سے بغاوت ونفرت موجود ہے اور وہ تمام روابط وتعلقات ٹوٹ چکے ہیں جو مسلمان کو دینی تعلیمات سے وابستہ کیے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے یہ حالت صرف اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں کوئی عظیم انحراف واقع ہو چکا ہے۔

صرف مسلم معاشرے کی اصل تصویر اور موجودہ معاشرہ جس میں ہم زندہ ہیں ان دونوں کے سطحی تقابل سے ہی یہ بات پُوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں معاشروں میں حیران کُن فرق ہے اور صاف پتہ چل جاتا ہے کہ ہماری موجودہ حالت اور اسلام کے مابین کتنا نمایاں بُعد ہے۔ اس وقت اسلام کے باقیات میں سے یا تو بار بار اُٹھنے والی آوازیں رہ گئی ہیں جو پورے عالمِ اسلام میں "رجوع الی الاسلام" کے لیے اُٹھ رہی ہیں یا پھر اسلامی دُنیا میں بکھرے ہوئے چند افراد ہیں جو اسلام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہیں اور غیر اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے جس قدر ممکن ہو سکتا ہے اسلام کے مُطابق زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس طرح دوسروں کو بھی دعوت دے رہے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ مل کر اسلام کو سمجھیں اور اس کے مطابق زندگی گزاریں۔

اسی طرح یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ مسلم معاشرے اور اسلام کے حقیقی مطالب ومفاہیم پر کچھ بہت ہی طاقتور عوامل اثر انداز ہوئے ہوں گے جن کی بنا پر اس معاشرے کا یہ حال ہو گیا ہے جو اب ہے۔ کیونکہ یہ بات کچھ غیر طبعی سی ہے کہ شدید تر عوامل کے اثر انداز ہوئے بغیر یہ قوۃ (اسلام) از خود ہی ضائع ہو جائے۔ اور یہ بھی غیر طبعی امر ہے کہ انسان خود اپنے اور اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کے بارے میں بلاوجہ غلط اندازے قائم کر کے رفعت وقوۃ اور غلبہ وتسلط کے مقام سے گر کر ذلت وپستی اور زوال وانحطاط کے مقام پر آ پڑے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کچھ ایسے تباہ کُن عوامل ضرور ہوں گے جنھوں نے نفس کے اندر ہی اندر

کام کر کے اس کے وجود کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ چنانچہ اب ہم دیکھتے ہیں کہ آخر اس انحراف کی ابتدا کیسے ہوئی اور کس طرح یہ پھیلتا اور بڑھتا چلا گیا۔

انحراف کا نقطۂ آغاز

مسلم معاشرے میں انحراف کی ابتدا کیسے ہوئی اور پھر کس طرح یہ بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا؟ کیا یہ بات ممکن تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دُنیا سے تشریف لے جانے اور مسلمانوں کے دلوں سے آپؐ کی ذاتِ اقدس سے براہِ راست حاصل ہونے والے فیضِ صحبت کے اثرات ختم ہو جانے کے بعد بھی مسلم معاشرہ طویل عرصہ تک اپنے بلند و برتر معیار کو قائم رکھتا؟

اگر ہم اس سوال کا جواب اثبات میں دیں تو یہ حقیقت پسندی نہ ہو گی لیکن یہ کہنا بھی حقیقت کے خلاف ہے کہ آپؐ کے وصال کے بعد اور آپؐ کی ذاتِ مبارک سے براہِ راست حاصل ہونے والے فیضِ صحبت کی تاثیر کے منقطع ہوتے ہی اسلامی معاشرہ اپنی بنیادوں سے ہٹ گیا تھا اور ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔

یہ بات نہ صرف حقیقت پسندی ہی کے خلاف ہے بلکہ مومن ہونے کے بھی منافی ہے۔

حقیقت پسندی کے خلاف تو اس لیے ہے کہ اس صورت میں گویا ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ زندگی کے اعلیٰ نظریات اور اصول و اقدار پر انسان کا ایمان شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اور یہ کہ ان نظریات و اقدار کو بروئے کار لانے کے لیے خارقِ عادت قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے اور جب یہ قوتیں دُنیا سے پردہ کر جاتی ہیں تو ایمان بھی ختم ہو جاتا ہے، یہ کہہ کر ہم انسانی صلاحیتوں کی قدر و قیمت گھٹا رہے ہوں گے۔ نہ صرف قدر و قیمت گھٹا رہے ہوں گے بلکہ ہم تاریخ عالم میں انسان کے عملی کردار سے بھی تغافل کا ثبوت دیں گے کیوں کہ انسان اپنی تاریخ میں زندگی کی اعلیٰ مثالوں اور اقدار و اصول پر نہ صرف ایمان لاتا رہا ہے بلکہ

ان کی تبلیغ وبقا کے لیے بھی جدوجہد کرتا رہا ہے اور ان کی وجہ سے تکالیف بھی برداشت کرتا رہا ہے۔ مزید براں ایسا کرکے ہم اس واضح حقیقت سے بھی صرفِ نظر کے مرتکب ہوں گے کہ اسلام ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ تک دنیا میں ایک زندہ قوت رہا ہے۔

اور مومن ہونے کے منافی اس طرح ہے کہ اس صورت میں ہم یہ تصور کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے جو اتنا اہتمام کیا کہ ان کے لیے اپنی کتاب نازل فرمائی۔ پھر اپنا رسول بھیج کر اس کتاب کی رہنمائی کے مطابق ایک اُمت وجود میں لانے اور کتاب کے قوانین اور قانونی توجیہات کے مطابق اُن کو تربیت دینے کی ذمّہ داری اس رسول پر ڈالی اور کتاب میں جو تمام قوانین اور توجیہات تفصیل سے بیان کی ہیں یہ سب انتظام اللہ نے صرف چند سالوں یا چند دہائیوں کے لیے عارضی طور پر کیا تھا۔

یہ تصوّر اس قدر فضول اور نازیبا ہے کہ ایسی بات اس زمین کے بعض فانی انسانوں کے متعلق کہنا بھی نامناسب ہے چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کے متعلق جو کہ زندگی اور کائنات کا خالق ہے ایسا تصوّر کیا جائے۔

ہرگز نہیں! یہ امر قطعی غیر طبعی ہے کہ مسلم معاشرے کی بنیادیں صرف اس وجہ سے ٹوٹ پھوٹ جائیں اور معاشرہ اپنے اصولوں سے منحرف ہو جائے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دُنیا سے تشریف لے جانے کی بنا پر آپؐ کے فیضِ صحبت کا اثر لوگوں کے دلوں پر باقی نہیں رہا تھا۔

اسی طرح یہ بات بھی غیر طبعی ہو گی کہ عظمت و رفعت کا وہی معیار قائم رہے جو آپ کے زمانہ مبارک میں تھا بلکہ ضروری ہے کہ بعض چیزوں میں زوال و تنزل پیدا ہو جائے۔

چنانچہ یہی ہُوا کہ جب تک آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک مسلمانوں کے درمیان جلوہ فرما رہی صحابہ کرامؓ کی شخصیتیں آپؐ کے فیضِ صحبت کے اثر سے غیر معمولی طور پر بلند ہو گئیں اور جب معاشرہ آپؐ کی ذاتِ مبارک سے براہِ راست حاصل ہونے والے

فیض سے محروم ہو گیا۔ تو لوگ اپنی ذات اور اپنے وجود کے دائرے کے اندر واپس آ گئے اور ان حدود میں رہ کر زندگی گزارنے لگے جو اسلام نے مقرر کی ہیں۔

اسلام ــــ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں فرق ہے یہ فرق وہی ہے جو آپؐ کے وصال کے بعد ایک سچی بات کہنے کے انداز میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیان کیا تھا کہ: یَا اَیُّھَا النَّاسُ مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ۔ وَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ"۔ اے لوگو! (اچھی طرح سُن لو اور سمجھ لو) کہ تم میں سے اگر کوئی شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا تو آپؐ تو انتقال فرما چکے ہیں۔ البتہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ وہ زندہ ہستی ہے جس کے لیے موت نہیں ہے"۔ اور اسلام بھی کلمۃ اللہ ہے اس لیے یہ بھی ہمیشہ زندہ رہے گا اور اس کے لیے بھی موت نہیں ہے۔

اسلام کی تاثیر انسانی قلوب میں ابدی اور دائمی ہے اس لیے کہ یہ اسلام ہی ہے جو اللہ حیّ و قیوم کے ساتھ انسانی قلوب کا رابطہ استوار کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے لوگ اللہ تعالےٰ کے احکام و فرامین کا اتباع کرتے ہیں اور خود کو اس کی منشا کے مطابق تربیت دیتے ہیں۔

دوسرے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کا فیضان اور آپؐ کی برکتوں کی تاثیر بھی صرف آپؐ کی حیات مبارکہ کے دَور تک ہی محدود نہیں تھی۔ آپؐ کی ذات کی رہنمائی اور آپؐ کا اسوہ مبارکہ اس وقت تک موجود اور قائم و دائم ہے جب تک لوگ اس سے فیض حاصل کرنے کے لیے اپنے دل کھلے رکھیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ آپؐ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی لوگ مسلمان رہے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اسلامی تاریخ میں مثالی دَور ہمیشہ نہیں رہا۔ اس لیے کہ سُنّت اللہ یہی ہے کہ اس دنیا کی کسی چیز کو دوام نہیں ہے مگر ایک مثالی دَور کا ایک مرتبہ وجود میں آ جانا بہرحال ضروری تھا تاکہ ہر وقت ایک روشن تصویر اور واضح نقشہ نظروں کے سامنے موجود

رہے۔ اور آئندہ نسلیں حسبِ استطاعت اس کے اتباع کی کوشش کرتی رہیں۔ اور اس کی پیروی کرنے والے لوگ آنے والے زمانوں میں اسی رفیع اور اونچے معیار تک پہنچ کر اسلام کو نئی زندگی اور نئی قوت سے ہمکنار کرتے رہیں خواہ زمانہ کتنا ہی بدل جائے اور سفر کتنا ہی طویل ہو جائے اور لوگ راستے سے بھٹک چکے ہوں (لیکن یہ لوگ دوسروں کو صحیح راستے پر چلاتے رہیں) غالباً اس نادر اور مثالی دور کے وجود میں لانے کی حکمت تقدیرِ الٰہی کے پیشِ نظر یہی تھی اور مسلمانوں کی تاریخ کے گزشتہ چودہ سو سالوں میں نور و ظلمت کے ادوار کا پے در پے آنا اس حقیقتِ واقعہ کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

تو گویا جو بات ضروری قرار دی گئی تھی۔ یہ تھی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی جب تک اللہ چاہے اسلامی معاشرہ اسلام پر قائم رہے اور اطراف و اکنافِ عالم میں پھیلتا چلا جائے اور اسلام کے اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے اسلامی مفہوم کے مطابق زندگی بسر کرے۔

اور یہ ایک حقیقتِ واقعہ ہے کہ یہ منصوبہ بڑی حد تک کامیاب رہا اور تاریخ میں ایک طویل ترین دور تک یہ معاشرہ اسلامی اصولوں پر چلتا رہا۔ اگرچہ یہ بھی درست ہے کہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں وہ بلند معیار باقی نہ رہا تھا جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور خلفائے راشدین کے دور میں تھا لیکن اس کے باوجود اسلامی معاشرہ ان تمام نظاموں، تہذیبوں اور قدروں کے مقابلہ میں جن سے دنیا واقف ہے ہمیشہ اور ہر حالت میں انتہائی اعلیٰ و ارفع رہا ہے۔

گزشتہ صفحات میں مستشرق "ویلفرڈ کانٹویل اسمتھ" کا یہ قول بیان ہو چکا ہے کہ "روئے زمین پر آج تک انصاف کے لیے جتنی بھی کوششیں کی گئی ہیں یا کی جا رہی ہیں ان میں اسلام کی کوشش سب سے زیادہ جدوجہد کی حامل اور عظیم تھی۔" اسی طرح ہم دوسرے مستشرقین کے اقوال بھی پیش کر چکے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ کس طرح زندگی

کے تمام پہلوؤں پر اسلام چھاتا چلا گیا حتیٰ کہ اس وقت تک دریافت شدہ پورا کرۂ ارض اس کے زیرِ اثر آ گیا۔ اور یورپ نے بھی دورِ جدید کی نشاۃ ثانیہ کے تمام مراحل میں روشنی اسلام ہی سے حاصل کی ہے۔

"بریولٹ" کے مطابق آج جدید دنیا کی تمام تہذیبیں انسانیت کے جس معنیٰ پر استوار ہیں یہ وہی معنیٰ ہیں جو مسلمانوں نے ضمیرِ بشریت میں داخل و راسخ کیے تھے اور جو یورپ نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کے دور میں اور اندلس اور شمالی افریقہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر کے سیکھے تھے۔

بنا بریں بعض مسلمانوں کا یہ وہم قطعاً بے بنیاد ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم کے دور کے بعد اسلام ختم ہو گیا تھا البتہ صحیح بات یہ ہے کہ خیر القرون کے بعد اسلامی تاریخ کا مثالی دور ختم ہو گیا تھا اور رسمی دور شروع ہو گیا تھا اگرچہ یہ دور بھی صرف اسلامی معیار کے لحاظ سے رسمی ہے ورنہ تاریخ عالم کے اعتبار سے روئے زمین کا اعلیٰ ترین دور تھا۔

انحراف کی ابتدا — اموی دور

لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ انحراف کا آغاز خلافتِ راشدہ کے ختم ہوتے ہی ہو گیا تھا۔ یعنی بنی اُمیہ کے دور میں ہی حکمرانی کی سیاست اور مالی سیاست کے اسلامی اصولوں میں دراڑ پڑ گئی تھی جب موروثی بادشاہت کی طرز پر جبر و استبداد کی ابتدا ہو گئی تھی اور طبقۂ اُمرا اور بادشاہ کے حاشیہ نشینوں نے جاگیردارانہ انداز و اطوار اپنا لیے تھے۔

مگر اس کے باوجود معاشرہ بحیثیتِ مجموعی اسلامی رہا۔ خرابی اور فساد صرف دارالحکومت میں پیدا ہوا تھا اور جزوی حیثیت کا تھا جس کا دائرہ بادشاہوں اور اُمرا کی طرف سے محض مالی امور اور حکمرانی کی سیاست تک محدود تھا اور یہ اُمرا بھی اپنی بے اعتدالیوں کے باوجود ذاتی طور پر اسلامی اصولوں کو مانتے تھے اور لوگوں کے تمام چھوٹے بڑے معاملات میں

قانونِ اسلامی کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے۔ البتہ اُن مالی اور حکومتی اُمور میں جن کا تعلق ان کی اپنی ذات اور اپنے قریبی رشتہ داروں سے ہوتا تھا کبھی کبھی حیلے بہانے اختیار کر لیتے تھے۔ بے شک (سلاطین و اُمرا، جو کچھ کیا کرتے تھے) یہ فساد ہی تھا لیکن جزوی فساد تھا۔ دارالحکومت سے نکل کر بقیہ اسلامی معاشرے تک نہیں پہنچا تھا اور سوائے چند لوگوں کے بالعموم مسلمانوں کی روزمرہ زندگی اس سے متاثر نہیں ہوئی تھی۔ مسلمان اسلامی تعلیمات کے زیرِ سایہ زندگی گزارتے تھے اور اسی کے مطابق کاروبارِ حیات کو ترتیب دیتے تھے۔ اور علماً بھی دنیا کے مختلف خطوں میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے واقعی طور پر کوشاں رہتے تھے۔ انھیں اُس اعزاز و اکرام کا بھی پُورا پُورا شعور حاصل تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذاتِ اقدس، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنوں کے لیے مخصوص فرما رکھا ہے اور اس بلندی و برتری کا بھی پورا احساس تھا جو ایمان کی تاثیر سے مومنوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے اور اس عظیم ذمہ داری کو بھی خوب محسوس کرتے تھے جو مومن ہونے کی بنا پر ان کی اپنی ذات اور معاشرے کے سلسلے میں ان پر عاید ہوتی ہے انھیں اس حقیقی اخوت کا شعور بھی تھا جو مومنوں میں آپس میں ہونی چاہیے۔ ایک دُوسرے کے ساتھ محبت اور تعاونِ باہمی کے معنیٰ بھی بخوبی سمجھتے تھے اور انھیں اپنے ایک منفرد اُمت ہونے کا بھی بھرپور احساس تھا۔ مُسلمان دُنیا کے اسلامی ملکوں میں سے کسی ملک میں چلے جائیں جب آپس میں ملتے تھے تو ان ملکوں میں حکومتیں مختلف ہونے کے باوجود ان اختلافات کو خاطر میں نہ لاتے ہُوئے سب ایک دُوسرے کو اپنا بھائی سمجھتے تھے اور آپس میں محبت و ہمدردی اور اخوت سے ملتے تھے اور ان سے اسی ایثار و خلوص کا سلوک کرتے تھے جو اپنے رشتہ داروں سے کیا جاتا ہے۔ انھیں یہ بھی احساس تھا کہ مال و دولت کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اور سب لوگ اس میں باہم شریک ہیں۔ نہ تو کسی مال دار کو زیادہ لینے کا حق ہے اور نہ کسی غریب کو محروم رہنا چاہیے۔ انھیں یہ بھی پُورا احساس تھا کہ ان کا ذاتی عمل و کردار اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی منشا کے مطابق ہونا چاہیے خواہ اس کے لیے کتنی ہی جدّ و جہد کیوں نہ کرنی پڑے جو در حقیقت یہ بہت ہی بڑی جدّ و جہد ہے۔ انھیں یہ شعور بھی تھا کہ اللہ کا قانون ہی زندگی کے تمام اطوار و اَدوار کے لیے ابدی قانون ہے اور ان کے معاملاتِ حیات کو مستحکم کرنے اور انسانوں کے آپس کے تعلقات کو منظم کرنے کے لیے اس دستور کے علاوہ کوئی دُوسرا دستور نہیں ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ حقیقی غلبہ اور قوت حاصل کرنے اور انسانیت کو تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کے لیے واقعی طور پر علم و عمل اور سخت کوشش سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ دراصل مسلمانوں کا یہی احساس و شعور زندگی کے تمام پہلوؤں میں ان کی ان کامیابیوں اور کامرانیوں کا حقیقی سبب تھا جو تاریخ میں یادگار رہیں۔

عباسی دَور

پھر عباسی دَور شروع ہُوا تو حکومت کی پالیسیاں مرتب کرنے اور کاروبارِ جہانبانی کی تشکیل میں ایرانیوں کا عمل دخل ہو گیا۔ اور اسلامی افکار میں بعض اجنبی خیالات بھی شامل ہو گئے۔ جن میں سب سے نمایاں تصوّف اور تجرید نظر (علم کو عمل سے جُدا کرنے) کا فلسفہ تھا جو اسلام کی "مثالی واقعیت پسندی" کے تصور سے جوڑ میل نہ کھاتا تھا۔ اسی طرح دارالحکومت میں طرح طرح کی بداخلاقیاں در آئی تھیں۔ خلفاء، امیروں اور ان کے حاشیہ نشینوں کے محلّات میں لونڈیوں، گویّوں اور مسخروں کی کثرت اور ان چیزوں پر بے جا فخر و غرور اور نمود و نمائش کی وجہ سے ان محلّات میں کھیل کُود، فسق و فجور، بے کاری اور کم کوشی کی ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی جس سے اسلام قطعاً نا آشنا تھا اور جسے وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ان خرافات کو اور محلّات کے ذلیل ماحول کی پیداوار اس بدبُودار غلاظت کو محض اپنی روزی کی خاطر ادیبوں نے اپنے فن و ادب کے ذریعے دُور دُور تک پھیلایا اور ادیبوں کا "فن" بھی اسلام کے "حقیقی فن" سے (جو حقیقتِ کائنات کے اسلامی تصور سے اُبھرتا ہے اور اسی حقیقت کا ترجمان ہوتا ہے)

زیادہ سے زیادہ دُور ہوتا چلا گیا۔ اور ادیبوں نے اسی فن کو اُمرا سے قریب تر ہونے اور ان کی تفریح اور کھیل کود کا ذریعہ بنا لیا ان ادیبوں کی تخلیقات مفہومِ زندگی کی تعبیر سے اکثر خالی ہوتی تھیں۔

بے شک ان خرابیوں کا کچھ نہ کچھ حصہ باقی ماندہ مسلم معاشرے پر بھی اثر انداز ہوا تھا لیکن اگر ہم اس وقت کے پُورے معاشرے کے متعلق یہ فرض کر لیں کہ وہ بھی دار الخلافہ کے غیر اخلاقی فسق و فجور کے رنگ میں رنگ چکا تھا اور تمام لوگوں نے خلفاء، اُمراء اور ان کے حاشیہ نشینوں کی سی عیاشانہ اور فساد میں ڈُوبی ہوئی زندگی اختیار کر لی تھی تو یہ تصور انتہائی غلط ہوگا۔

اگرچہ تاریخ کی کتابوں نے خاص طور پر مغربی مُصنّفین کی لکھی ہوئی کتابوں نے اس دور کے اسلام کی اس بگڑی ہوئی تصویر کو اُبھارنے میں بہت زیادہ دلچسپی لی ہے لیکن جو شخص بھی صرف ایک نسل پہلے کے اسلامی معاشرے کے متعلق معلومات حاصل کرے گا کہ اس دَور میں تمام اسلامی ملکوں میں دار الحکومت کی زندگی کے کیا رنگ ڈھنگ تھے اور دیہات میں لوگوں کی بود و باش کا کیا انداز تھا وہ ان دونوں طبقوں کی زندگیوں کے انتہائی نمایاں فرق کو فوراً محسوس کر لے گا اور اسے معلوم ہو جائے گا کہ دار الحکومت کی خرابی اور بے راہ روی باقی ماندہ اسلامی معاشرے کے مقابلے میں (جو دار الحکومت اور وہاں کی بے لگام عیش و عشرت کی زندگی سے دُور رہتے ہوئے اسلامی روایات کا پابند تھا) کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔

ہم یہاں تاریخ کی کتابوں کے انداز میں مسلمان بادشاہوں اور خلیفوں کی تاریخ بیان نہیں کر رہے بلکہ ہمارے پیشِ نظر پُورا اسلامی معاشرہ ہے اور اُن عام لوگوں کی تاریخ سامنے رکھ رہے ہیں جن سے کوئی قوم وجود میں آتی ہے اور جو اس فکر و عقیدے کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں جس پر وہ ایمان رکھتے ہوں۔ ہم نے کہا ہے کہ دار الحکومت میں پھیلی ہوئی بے راہ روی کا عکس معاشرے پر ضرور پڑا تھا لیکن دار الحکومت میں موجود

خرابی کے مقابلے میں یہ اثر بہت ہلکا تھا۔ اس لیے کہ اگر ایک طرف دار الخلافہ کے محلات میں شراب، لونڈیوں اور لہو و طرب میں ڈُوبے رہنا وقت کا فیشن تھا اور ان خرافات پر مال و دولت اور انسانی محنتیں ضائع کی جا رہی تھیں تو دوسری طرف اسی دار الحکومت میں وہ علماء بھی تھے جو ہر قسم کے ہنگاموں سے دُور اور محلات کی جھُوٹی شان و شکوہ سے بے نیاز گوشہ ہائے تنہائی میں بیٹھے ترجمہ و تالیف میں مصروف تھے اور اپنی اپنی مخصوص رصد گاہوں، تجربہ گاہوں اور کتب خانوں میں محصور ہو کر علمی تحقیقات میں جُتے ہُوئے تھے۔ فقہاء علومِ فقہ کے درس و تدریس میں مصروف اس علم میں مہارت حاصل کر کے خالص اسلامی روح کے مطابق فقہ کے سرمائے میں اضافہ کر رہے تھے، ماہرینِ جغرافیہ سیاحت کے ذریعہ اللہ کی وسیع زمین کے بارے میں نئے نئے انکشافات کر کے خالص علمی انداز میں اپنی یادداشتیں مُرتب کر رہے تھے تاکہ امانتِ علم کی ادائیگی میں ان کا طُرۂ امتیاز باریک بینی اور خالص علمی تحقیق ہو۔ ان لوگوں کے علاوہ مجاہدین تھے جو دعوتِ اسلام پھیلانے کے لیے طویل طویل فاصلے طے کر کے ایشیائے بعید میں ایک طرف چین اور انڈونیشیا وغیرہ تک اور دوسری طرف سوڈان کے مشرقی اور مغربی خطوں تک پہنچتے تھے۔ اُدھر مجاہدین ہر جگہ اور ہر مقام پر دشمنانِ اسلام کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ اس معاشرے کا شہروں، قصبوں اور دیہات میں رہنے والا عام آدمی صرف مسلمان تھا جو اسلام کی رُوح کے مطابق زندگی بسر کرتا تھا۔ اور اس نے اسلام کو اپنی زندگی میں پُوری طرح نافذ کر رکھا تھا۔ وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہدایت حاصل کرتے ہُوئے حرام سے بچتا تھا اور حلال کے لیے کوشاں رہتا تھا اور اسلامی تعلیمات سے مطابقت رکھنے والی تمام معاشرتی روایات کی پُوری طرح حفاظت کرتا تھا۔

اس کے معنیٰ یہ ہرگز نہیں ہیں اور طبعاً ایسا ہونا بھی چاہیے کہ یہ معاشرہ ایک مکمل مثالی اور ہر لحاظ سے باکمال معاشرہ تھا! کیونکہ یہ مثالی تکمیل تو تاریخ کے کسی دَور میں اور اس

دنیا کے کسی معاشرے میں کبھی وجود میں نہیں آئی حتٰے کہ اس معاشرے میں بھی جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تربیت فرمائی تھی۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس معاشرے میں خیر شر پر، اسبابِ رفعت پستی کے ذرائع پر اور اعلیٰ درجے کی روایات گھٹیا روایات پر غالب تھیں۔ عباسی دَور کا یہ معاشرہ اُموی دَور کے معاشرے سے مجموعی طور پر ادنیٰ درجے کا تھا لیکن اس کے باوجود ایک مسلم معاشرہ تھا جو بعض اِدھر اُدھر کی چند باتوں میں انحراف و فساد کے باوجود اسلام کے مطالب و مفاہیم کے مطابق زندگی بسر کرتا تھا۔

عثمانی ترکوں کا دَور

اس کے بعد ترکانِ عثمانی کا دَور آیا اور اسلامی حکومت کا نظم و نسق ترکوں کے ہاتھ میں آگیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترکوں نے جنگی فتوحات کے اعتبار سے اسلام کو بہت ہی اعلیٰ درجہ کی عظمتیں عطا کیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ترکوں کے ہاتھوں اسلام کے بہت سے مفاہیم بھی مسخ ہو کر رہ گئے۔ یا دُوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دَور میں اسلام پر جمود طاری ہو گیا اور اس کا نشو و ارتقار رُک گیا۔

اسلام کے ظہور کی ابتدا سے اس کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ ایک متحرک قوت ہے۔ زندگی کے ہر میدان میں متحرک اور فعال قوت۔ خواہ وہ معرکۂ جنگ میں کامیابی حاصل کرنا ہو یا علم کے میدان میں کامرانی ہو۔ علم فقہ کا میدان ہو یا علم الاقتصاد و علم الاجتماع کا، یا فکر و سیاست کا غرض زندگی کا کوئی پہلو اس کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

لیکن جب ترکانِ عثمانی کو اقتدار حاصل ہُوا تو ان کی حربی عبقریت اور غیر معمولی عسکری قوت کے باعث میدانِ جنگ میں تو انھیں ہر طرح کی کامیابی حاصل ہوئی لیکن زندگی کے باقی میدانوں میں ناپسندیدہ جمود طاری ہو گیا۔

انھیں (ترکوں کو) علم کی اہمیت کا بھی کچھ زیادہ احساس نہ تھا جس کا نتیجہ (جیسا کہ تاریخ میں درج ہے اور سب مؤرخ جانتے ہیں) یہ ہُوا کہ اس زمانے میں جب یورپ علومِ اسلامی کے

سرچشموں سے سیراب ہو کر اپنی نشاۃِ نو کی بنیادیں رکھ رہا تھا، عین اسی دَور میں اسلامی علوم کا ارتقار رُک گیا۔

ترک فقہ میں بھی اجتہادی صلاحیت کے مالک نہ تھے چنانچہ انھوں نے اپنی پرہیزگاری کے تقاضے سے جو کچھ کیا وہ صرف اتنا تھا کہ پہلے سے موجود علمی میراث سے استفادہ کرتے رہے اور اس ذخیرے کو وہ جس حالت میں تھا اسی حالت پر منجمد کر دیا اور اس میں مزید کوئی اضافہ نہ کیا۔ حالانکہ فقہ تو علامت ہی اس بات کی ہے کہ معاشرہ اسلامی فکر کی روشنی میں مسلسل ارتقار پذیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ہولناک اور ناپسندیدہ دَور میں فقہ میں جمود کے ساتھ ساتھ معاشرتی ارتقار بھی رُک گیا اور یہ اتنا شدید نقصان تھا کہ اسلام کی طویل تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اس دَور میں بھی معاشرے نے اپنی موروثی روایات کی حفاظت ضرور کی لیکن یہ روایات اپنی معنویت کھو بیٹھی تھیں اور صرف بے رُوح مظاہر بن کر رہ گئی تھیں جو اپنی جگہ مقدس ضرور تھیں لیکن اپنا حقیقی مقصد پُورا کرنے سے قاصر تھیں۔ اس کی ایک مثال ترکوں کے پردے کا انداز ہے جو بظاہر معاشرتی مظاہر میں سے ایک مقدس مظہر خیال کیا جاتا ہے لیکن اسی پردے کے پیچھے خلافتِ عثمانی کے آخری دَور میں محلات کے اندر اور لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہر قسم کے فسق و فجور کا بازار گرم تھا۔

دراصل یہی وہ ناپسندیدہ دَور ہے جس سے اسلام کے لیے حقیقی خطرے کی ابتدا ہوئی ہے کیونکہ کسی فکر یا نظام کے لیے اس سے زیادہ خطرناک بات اور کوئی نہیں ہے کہ اس کا نشو و ارتقا رُک جائے اور وہ کسی ایک صورت پر جامد ہو کر رہ جائے۔ اس لیے کہ جب کسی مُعاشرے پر جمود طاری ہو جاتا ہے تو اس معاشرے کا انحطاط و زوال سے دوچار ہونا یقینی ہوتا ہے۔

اس تمام مدّت (اموی دور سے ترکی دور تک) کے دوران اسلام کو متعدد سخت اور المناک داخلی و خارجی حادثات سے دوچار ہونا پڑا مثلاً حکمران خانوادوں کی باہمی کشمکش، منگولوں اور تاتاریوں کی یلغار اور صلیبیوں کے پے در پے حملے وغیرہ لیکن جب ترکوں کے دَور میں

جمود کا یہ وقفہ آیا تو اسلام پر آنے والی مصیبتوں میں سے یہ مصیبت سب سے بڑی ثابت ہوئی۔

اسلام کی گھات میں بیٹھے ہوئے صلیبیوں نے اس موقعہ سے خوب فائدہ اٹھایا کیونکہ یہی تو ان کے لیے ایک سنہری موقعہ تھا چنانچہ انھوں نے اسلام کو پوری طرح تباہ و برباد کرنے کے لیے دنیائے اسلام پر خطرناک حملے کیے اور اس پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ لیکن ان سب مصائب و حادثات کے باوجود جو اسلام کو داخلی اور خارجی دشمنوں کی طرف سے برداشت کرنے پڑے، کیا اسلام ختم ہو گیا اور باقی نہیں رہا؟

ہرگز نہیں!

اس لیے کہ عالم اسلام پر غلبہ حاصل کرنے کے صلیبیوں کو پوری ایک صدی تک اپنے تمام ذرائع سے کام لینا پڑا اور اس مقصد کے لیے انھوں نے ہر قسم کی قوت و طاقت استعمال کی پھر دنیائے اسلام کو بزعم خود ختم کرنے اور آخری انجام تک پہنچانے کے لیے انھوں نے اسلامی ممالک پر تسلط حاصل کرنے کے بعد مزید پورے ایک سو سال تک ہر قسم کی عیاری، چالاکی اور مکر و فن سے پوری کوشش کی (لیکن اسلام کو ختم نہ کر سکے) اگرچہ صلیبیوں کی اس آخری یورش کے بعد سے عالم اسلام میں ایک عظیم اور خوفناک انقلاب آ گیا اور یہ انقلاب تاریخ اسلام کا سب سے بڑا فساد و انحراف ثابت ہوا۔

اس فساد و انحراف کے بعد بھی اسلامی معاشرہ اگرچہ کمزور اور جامد تو ضرور ہو گیا، مگر زوال پذیر نہیں ہوا۔ کیونکہ اسلامی عقیدے میں زندہ رہنے کی غیر معمولی قوت و صلاحیت موجود ہے دراصل زندہ رہنے کی اسی صلاحیت کے بل بوتے پر اسلام تمام گزشتہ ادوار میں ان بے شمار حادثات اور صدموں کو سہہ جاتا رہا جو اسے حکمران خاندانوں کی ایک دوسرے سے جنگ اقتدار اور تاتاریوں اور صلیبیوں کے پے در پے حملوں کی وجہ سے پہنچتے رہے اور کچھ عرصہ کے بعد پھر اپنی قوت بحال کر کے دوبارہ غالب آ جاتا رہا۔ زندہ رہنے کی یہی قوت و صلاحیت عثمانی ترکوں کے ناپسندیدہ دور میں پھر بیدار ہو

گئی اور ان کے بندھنوں سے چھٹکارا پا کر آزاد ہونے کی جدوجہد کرنے لگی۔ یہی قوت تھی جو اس وقت مختلف تحریکوں مثلاً حجاز میں وہابی تحریک اور سوڈان میں مہدی کبیر کی مہدوی تحریک کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ یہ تحریکیں یقیناً ایسی تھیں کہ اسلام کو دوبارہ زندگی اور آزادی بخش کر انسان کی کتابِ زندگی میں نئے ابواب کا اضافہ کرنے کے قابل بنا دیتیں۔ لیکن صلیبی سامراج نے عالم اسلام کو بیدار ہونے کا موقع نہیں دیا اور بڑی تیزی سے اپنے قدیم دشمن کو ختم کرنے کے لیے اپنے تمام شیطانی وسائل سے لیس ہو کر میدان کارزار میں کود پڑا تا کہ اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے اور اس کی بیخ کنی کر دے۔

اس مرتبہ سامراجیوں کا حملہ صرف فوج اور لشکر کے بل بوتے پر نہ تھا جیسا کہ اس سے پہلے ہوتا رہا بلکہ فوج و لشکر کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے سائنسی ذرائع، دھوکہ فریب اور مکر و فن سے کام لے کر انھوں نے اسلامی تعلیمات کو مسخ کیا۔ پھر اس مسخ شدہ اسلام کو نشر و اشاعت کے ذرائع سے مسلمانوں میں پھیلا کر ان کے دل و دماغ میں اُتارنے کی کوشش کی تا کہ اگر انھیں اپنے مشنریوں کے ذریعہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں کامیابی نہ ہو سکی تو کم از کم مسلمان حقیقی اور اصلی اسلام سے ہی برگشتہ ہو جائیں۔

اور یہی ہوا جس وقت سے صلیبی سامراج نے اسلامی دنیا میں اپنی جولانیاں شروع کیں مسلم معاشرے میں انحراف و فساد کی ابتدا ہو گئی اور ایسے ایسے عجیب و غریب اور اجنبی افکار و خیالات پیدا ہونے لگے جو اس سے پہلے اسلام کے کسی رفعت یا زوال کے دور میں موجود نہیں تھے۔ اب اس قسم کی باتیں کی جانے لگیں کہ دین کو معاشرتی نظام سے کیا تعلق، دین کا اقتصادیات سے کیا واسطہ، دین کو فرد اور معاشرہ اور فرد و حکومت کے باہمی تعلقات میں کیا دخل، اسی طرح دین کا رسم و رواج سے، دین کا لباس سے خصوصاً عورت کے لباس سے کیا سروکار۔ یا پھر دین اور فن، دین اور صحافت دین اور ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما کا ایک دوسرے سے کیا رابطہ۔ مختصراً گویا دین کا زندگی

سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے اور دین کو انسان کی اس حقیقی زندگی سے جو وہ اس زمین پر گزارتا ہے یکسر خارج کر دینا چاہیے۔

اور اب اسلامی معاشرے میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو کہتے ہیں کہ جب تک کوئی شخص نماز روزہ ادا کرتا ہے وہ مسلمان ہے اور اس بات کا پابند نہیں کہ اپنے لیے اقتصادی نظام بھی دنیا کے کسی غیر اسلامی نظام فکر سے مستعار نہ لے۔ یا اپنے افکار و روایات کی بنیاد کسی غیر اسلامی نظام کو نہ بنائے۔ اسی طرح اب اسلامی معاشرے میں عورت یہ کہتی ہوئی سنی جاتی ہے کہ جب تک انسان کی نیت ٹھیک ہے وہ مسلمان ہے لیکن مسلمان ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نوجوان لڑکی لڑکوں سے میل جول اور اختلاط بھی نہ رکھے۔ اور نہ مسلمان ہونے کے یہ معنی ہیں کہ عورت جدید ترین فیشن کے مطابق لباس نہ پہنے خواہ اس لباس سے سینہ، کمر، بازو اور پنڈلیاں عریاں ہی کیوں نہ ہوتی ہوں یا سمندر کے کنارے بدن کے مختصر سے حصہ کی ستر پوشی کے علاوہ پورے جسم کو ننگا ہی کیوں نہ رکھنا پڑے بعینہٖ اگر زینت و آرائش کے تمام لوازم استعمال کر کے بوقت ضرورت اگر کسی پارٹی میں رقص کر لے تو اس سے اس کے اسلام پر کوئی حرف نہیں آتا۔

ان سب باتوں سے بڑھ کر اب مسلم معاشرے میں ایسے مرد و زن بھی موجود ہیں، جو علی الاعلان اپنی لادینی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دین تو رجعت پسندی، جمود اور پس ماندگی کی علامت ہے اور ضروری ہے کہ اسے یکسر مٹا دیا جائے تاکہ قوم بیدار ہو کر ترقی کی راہ پر قدم بڑھا سکے۔

اس قسم کے افکار اس ظالمانہ جدوجہد کا نتیجہ ہیں جو صلیبی سامراج عالم اسلام کو تباہ و برباد کرنے کے لیے پورے دو سو سال تک کرتا رہا ہے۔

لیکن دنیائے اسلام کے بگاڑ اور فساد کا واحد سبب یہی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بھی بہت ہی مؤثر عامل کارفرما ہے اور وہ ہے پوری دنیا میں انتشار و فساد سے پُر اور

اخلاق و کردار سے تہی دامن مادیت کی عالمگیر لہر جس میں دین سے متنفر اور بیزار کر کے خالص حیوانیت کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ اور جس بے راہ روی کی دنیا میں اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ مزید برآں یہ کہ اس اخلاقی بے راہ روی کو سائنس اور ٹیکنالوجی اور علم الاجتماع کے جدید نظریات کے زور پر درست ثابت کیا جاتا ہے اور ترقی و ارتقاء کے نام پر اس کے لیے ایک ضخیم فلسفہ تراش لیا گیا ہے تاکہ اس بے ہودگی کو مقبول عام بنایا جا سکے۔

مندرجہ بالا دونوں عوامل کے باعث ہی اسلام میں عظیم انحراف و فساد واقع ہوا ہے۔ ہم آئندہ ابواب میں ان دونوں عوامل پر تفصیلی بحث کریں گے۔

اس وقت ہم صلیبی چالوں کی وجہ سے عالم اسلام کی داخلی دنیا میں جو فساد پیدا ہوا اس کی تفصیلات بیان کریں گے یعنی "مقامی اور داخلی اسباب" پر روشنی ڈالیں گے۔

پر مسلمان محسوس کرتے رہے کہ یہ وقتی ہزیمت ہے جو حملہ آوروں کے لشکر کی کثرتِ تعداد یا اچانک حملہ ہو جانے کی وجہ سے برداشت کرنی پڑی ہے اور ہمیشہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات رہی کہ یہ ایک مختصر وقفہ ہے اس کے بعد مسلمان پھر تیار ہو کر جنگ میں کود پڑیں گے اور جب لوگ قربانی اور مقابلے کے لیے تیار ہوں گے تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائیں گے۔

اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا کہ جب بھی مسلمان اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجاہدین حفاظتِ اسلام کے جذبے سے سرشار ہو کر جنگ میں کود پڑے تو وعدے کے مطابق اللہ کی مدد پہنچی اور مسلمان فتح یاب ہوتے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمان اپنی سربلندی کی ہمیشہ حفاظت کرتے رہے ہیں حتیٰ کہ شکست و ہزیمت کے وقت بھی انھیں اپنے غالب ہونے کے سلسلے میں اور اس بات میں کہ بالآخر وہی کامیاب و کامران ہوں گے کبھی شک و شبہ نہیں ہوا۔ ہر وقتی شکست کے بعد بار بار فتح حاصل ہو جانے کی بنا پر مسلمانوں کے دل میں یہ بات مرتسم ہو چکی تھی اور ان کے شعور میں یہ یقین راسخ ہو چکا تھا کہ وہ ایمان کی بدولت ہی سربلند رہ سکتے ہیں اور ان کے اعزاز و اکرام کا واحد سبب یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ ان کی نظروں میں حملہ آور لشکریوں کی حیثیت ان کی کثرتِ تعداد اور ساز و سامان میں برتری کے باوجود ایسے پس ماندہ وحشیوں کی سی ہوتی تھی جو خدا سے ناآشنا ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ ان کے مقابلے میں حقیر اور کمتر ہیں اگرچہ عارضی طور پر جنگ میں حالات اور وقت ان کے لیے سازگار رہے اور وہ مسلمانوں پر غالب آ گئے ہیں۔ مسلمان ہمیشہ عیسائی کافروں کی فضول رسموں اور بُری عادتوں کو سخت ناپسند کرتے رہے۔

اس ناپسندیدگی کا اندازہ آپ کو "مقریزی" کے ان الفاظ سے ہوگا۔ "مقریزی" لکھتا ہے: "ان لوگوں میں مردانگی تو موجود ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں آپ

کو ایسے افراد بھی ملیں گے جو اپنی بیوی کو کھلے مُنہ، عریاں سینے اور بازوؤں کے ساتھ اپنے ہمراہ بازاروں میں لے کر نکلتے ہیں اور جب سرِ راہ بیوی کا کوئی دوست مل جاتا ہے تو شوہر علیحدہ کھڑا ہو جاتا ہے اور بیوی اپنے دوست سے باتیں کرتی رہتی ہے اور جب وہ دونوں گفتگو ختم کر لیتے ہیں تو شوہر بیوی کا ہاتھ بغل میں دبا کر پھر چل پڑتا ہے۔"

اس قسم کی باتیں قدرتی طور پر مسلمان معاشرے میں اخلاقی پستی کی دلیل اور گندی سمجھی جاتی تھیں مسلمانوں کا خیال تھا اس قسم کی حرکتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی معاشرے میں غیرت و شرافت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ مسلمان ان بیہودہ باتوں کو نہ تو برداشت کر سکتے تھے اور نہ اپنے معاشرے میں ان کے موجود ہونے کا تصور کر سکتے تھے۔[1]

الغرض اسلام کی سربلندی کا عقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں پوری طرح راسخ تھا اور وہ اس اعزاز کو بھی بخوبی محسوس کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور مومنوں کے لیے مخصوص فرما رکھا ہے۔ یہ احساس مسلمانوں کے دلوں میں پریشانی اور مصیبت کے ان مواقع پر بھی برقرار رہتا تھا جب صلیبی لشکر سیلِ بے پناہ کی طرح ان کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہوں۔ اس وقت بھی وہ یہی یقین رکھتے تھے کہ ہماری روایات کے علاوہ ہر قسم کے رسم و رواج گندے ہیں اور انھیں کسی صورت اختیار نہیں کرنا چاہیے اور سرزمینِ اسلام کو اس گندگی سے آلودہ کرنا جائز نہیں۔

لیکن فرانسیسی حملے کے بعد سے حالات کے زاویے بدل گئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسلامی عقاید اب بھی اسی طرح راسخ تھے لیکن عقیدے کا جذبہ

---

[1] مقامِ عبرت ہے کہ اب مسلم معاشرے کے ذہن میں کتنا عظیم انقلاب آ گیا ہے۔ آج مسلمان ان گندی باتوں کو ترقی پسندی، معیار کی بلندی اور معاشرے کی اعلیٰ اقدار خیال کرتے ہیں۔ (مصنف)

نرگوں کے دورِ حکومت میں جمود و تعطل کا شکار ہو کر زندگی کی وہ لچک اور حرارت کھو بیٹھا تھا جو گزشتہ تمام ادوار میں مسلمانوں کا طغرائے امتیاز رہا ہے۔ دین اب محض چند بظاہر مقدس رسوم کا نام رہ گیا تھا جن کے پیچھے نہ تو کوئی بڑا مقصد موجود تھا، نہ زندگی کی حرارت تھی اور نہ عملاً زندگی میں ان سے کوئی نتیجہ برآمد ہوتا تھا۔

اس پر مستزاد "نپولین" کے ہاتھوں "امبابہ" کے مقام پر مملوکوں کی وہ جنگی شکست تھی جو مسلمانوں کے لیے داخلی شکست یعنی دلوں میں عقیدے کی شکست کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

مسلمانوں کے دلوں میں نپولین کی توپوں کی ہیبت بری طرح بیٹھ گئی تھی اور وہ نپولین کے جدید جنگی ساز و سامان سے (جو انھوں نے کبھی پہلے دیکھا تھا اور نہ اس کے دشمن کے پاس موجود ہونے کا انھیں وہم و گمان تھا) اس قدر مرعوب ہو گئے تھے کہ اس کے مقابلے میں انھیں "مملوکوں" کی تلواریں بالکل بیکار اور مہمل معلوم ہوتی تھیں۔

اور اس طرح مسلمانوں کے ذہن میں توازنِ قوت و طاقت میں انقلاب سا آگیا تھا۔ گویا یہ پہلا موقع تھا جب مسلمانوں کو حقیقی معنی میں شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا اور صلیبی فوجوں کو غلبہ حاصل ہوا تھا اس لیے کہ اس دفعہ وہ جنگی سامان اور حربی تکنیک و سائنس کی ایسی قوت سے آراستہ تھے جو مسلمانوں کے پاس نہ تھی۔

بہت ممکن ہے اس وقت بھی دلوں کے اندر قوت کا توازن نہ بگڑتا اور لوگ شکست کا اثر قبول نہ کرتے ہوئے از سرِ نو مقابلے کی تیاری کرتے جیسا کہ پہلے بہت دفعہ ہو چکا ہے لیکن دراصل اس مرتبہ عقیدے کی اندرونی قوت اتنی زوردار نہ تھی کہ وہ اس صدمہ کو برداشت کرنے کے قابل بناتی اور دوبارہ مقابلے کے لیے تیار کرتی۔

یہ درست ہے کہ عوام نے اس فرانسیسی حملہ کا بڑا زبردست مقابلہ کیا تھا اور دینی رہنماؤں کی سرکردگی اور ان کے روحانی اثر و نفوذ کے زیرِ اثر اہلِ قاہرہ بپھر گئے تھے اور غیر معمولی

جرأت و شجاعت کے متعدد عجیب و غریب کارنامے ظہور پذیر ہوئے تھے جن میں سے سب سے خوبصورت کارنامہ "صعید" کے ایک نوجوان کا تھا جو اکیلا رات کو چپکے سے دشمن کے کیمپ میں گھس جاتا تھا اور اسلحہ کے ذخیرے میں سے بندوقیں نکال کر نہر میں تیرتا ہوا واپس آ جاتا تھا تاکہ مسلمان دشمنوں کے مقابلے میں مسلح ہو سکیں۔ چنانچہ جب دشمنوں کو اپنے اسلحہ میں کمی کا احساس ہوا تو ان کے پہریداروں نے نقب لگانے والوں کی نگرانی شروع کی ان کا خیال تھا کہ کوئی خطرناک گروہ یہ حرکت کرتا ہو گا لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھیں ایک تنہا نوجوان یہ کام کرتا ہوا نظر آیا۔ محافظوں نے جب اسے گرفتار کرنے کے لیے اس پر حملہ کیا تو وہ مقابلے پر ڈٹ گیا یہاں تک کہ جب مقابلے میں اس کا بازو ٹوٹ گیا تو اسے اٹھا کر اپنے آفیسر کے پاس لے گئے۔ آفیسر نے جب اس کی بہادری اور جرأت کے متعلق سنا تو اسے پیش کش کی کہ اس کا منہ بولا بیٹا بن جائے لیکن اس نے یہ کہہ کر پیش کش ٹھکرا دی کہ وہ کافر کا متبنیٰ نہیں بن سکتا۔ پھر افسر نے کہا کہ اگر آئندہ اسلحہ نہ چرانے کا وعدہ کرو تو تم کو چھوڑ دیا جائے لیکن اس نے کہا کہ جب تک دشمن میری سرزمین میں موجود ہے میں ایسا وعدہ نہیں کر سکتا۔ آخر کار انھوں نے اسے آزاد چھوڑ دیا اور بطورِ خود اپنے اسلحہ کی حفاظت کا انتظام سخت کر دیا۔

یہ درست ہے کہ اس قسم کے واقعات ظہور پذیر ہوئے جن کی حیثیت انفرادی فداکاری سے زیادہ نہ تھی لیکن نبرد آزما اسلامی حکومت کا حقیقی وجود یعنی ایسی حکومت جو اسلامی ہونے کی حیثیت سے لشکروں کو منظم کرے، جہاد کی تیاری کرے اور دشمنوں سے مقابلہ کرے، یہ حکومت "امبابہ" کے معرکے میں فنا ہو گئی تھی اور اس کا نام و نشان باقی نہ رہا تھا۔

اس مرتبہ مسلمانوں کے ذہن پر اس قدر احساسِ شکست مسلط ہو چکا تھا کہ

وہ اپنی آنکھوں کے سامنے غازیوں کو پسپا ہوتے دیکھتے رہے اور خاموش رہے
اس مرتبہ مسلمانوں کی حقیقی شکست صرف جنگ میں ہار جانا نہ تھی بلکہ نپولین نے اپنے
قیامِ مصر کے مختصر وقفے میں ہی مسلمانوں پر ایسے نئے قوانین نافذ کر دیے جو قانونِ الٰہی
سے مختلف تھے اور فرانسیسی قانون سے ماخوذ تھے اور اسلامی شریعت کو صرف
"شخصی احوال" (پرسنل لاء) مثلاً نکاح، طلاق اور میراث وغیرہ تک محدود کر دیا تھا۔

مسلمانوں کی پوری تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا۔

یعنی ایک ایسا بدترین سانحہ کہ مسلمانوں پر قانونِ الٰہی کے علاوہ کوئی اور قانون
مسلط کیا جائے جسے غیر مسلم بنائیں اور مسلمانوں پر نافذ کریں۔

اس سے پہلے بھی صلیبی مسلمانوں کے علاقوں میں بارہا داخل ہوتے رہے ہیں اور لمبا اوقات
ان علاقوں پر ان کا قبضہ کئی سال تک رہا ہے بلکہ سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کے
دور سے پہلے انھیں بحرِ متوسط کے کنارے پر شامی علاقوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم
کرنے کا موقع بھی مل گیا تھا مگر انھیں کبھی کسی موقعہ پر یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ مسلمانوں پر اپنا
بنایا ہوا قانون مسلط کر سکیں۔ ہر مرتبہ صرف یہی ہوتا رہا کہ کچھ لیٹروں نے مسلمانوں کے
کسی علاقے پر قبضہ کر لیا اور بس وہ کبھی کسی علاقے پر حکومت نہیں جما سکے۔

یہ پہلا موقعہ تھا کہ انھوں نے مسلم حکومت کو گھیر کر اور مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں
کچل کر مسلم سرزمین میں اپنی حکومت قائم کی تھی۔

دراصل یہی حادثہ مسلمانوں کی حقیقی شکست یعنی عقیدے کی شکست کا پیش خیمہ
بن گیا اور اسلامی عقیدہ واقعاتی دنیا سے کنارہ کش ہو گیا جس کی بنا پر اندرونی دنیا (نفس
کی دنیا) میں بھی اسلامی عقاید سکڑنا شروع ہو گئے۔

اسی شکست اور اضمحلالِ عقیدہ کے زیرِ سایہ ہی مصریوں کے دلوں میں فرانسیسی
حملہ سے مغلوب ہو جانے کے احساس میں شدت پیدا ہو گئی۔ پہلے ہتھیاروں کی قوت

سے حیران ہوئے پھر ان مغربی علوم نے جو فوج کے ساتھ آنے والے وفود اپنے ہمراہ
لائے تھے انھیں ششدر کیا پھر اس پریس سے مرعوب ہوئے جو نپولین مصر لایا تھا۔
مزید انھیں ان تنظیموں نے متاثر کیا جو نپولین نے مصر میں بنائی تھیں۔ الغرض ہر وہ چیز جو
پہلے مسلمانوں کے پاس نہ تھی اور اب مغرب سے آئی تھی ان کے لیے حیرت و مرعوبیت
کا باعث بن گئی۔

اس طرح یہ شکست اس حقیقی اور مکمل شکست کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس کے
بعد صلیبی سامراج کے لیے راستہ ہموار ہو گیا کہ وہ جس طرح چاہے مسلمانوں کی زندگیوں
کو تباہ کرے اور ان کے عقیدے، فکر اور شعور کو بگاڑ کر جس رنگ میں چاہے رنگ دے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی اس ذہنی اور داخلی شکست کے باعث فرانسیسیوں
کے مصر سے نکل جانے کے بعد بھی واقعاتی دنیا میں کوئی حقیقی فرق رونما نہیں ہوا اور
عملی دنیا سے اس کے اثرات ختم نہیں ہوئے۔

اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم تاریخی واقعات بیان کرنے سے پہلے
تھوڑی دیر ٹھہر کر دو نکات پر غور کر لیں:

پہلا نکتہ یہ ہے۔ کہ صلیبی سامراج کی خواہش ہمیشہ یہ رہی ہے اور اس سلسلے
میں مسلمان مؤرخوں نے بھی اس کی مدد کی ہے کہ مصر پر فرانس کے حملہ کی وجہ سے
اور اس کے بعد اسلامی ملکوں میں مغربی استعمار کا جو سیلاب آیا ہے اس میں موجود صلیبی
عنصر کی مکمل طور پر پردہ پوشی کی جائے۔ صلیبی عزائم پر پردہ ڈالنے کی کوشش میں اس حد تک
مبالغہ کیا گیا ہے کہ یہ دعویٰ بھی کیا گیا کہ خود صلیبی جنگیں بھی مذہبی لڑائیاں نہ تھیں
بلکہ ان جنگوں میں مذہب کا نام اقتصادی فوائد اور لالچ کو چھپانے کے لیے استعمال کیا
گیا تھا۔ اور سامراج کے ان بے بنیاد دعووں کی تائید بعض وہ مسلمان بھی کرتے ہیں جو
استعمار کی چکی میں پس رہے ہیں اور آنکھیں بند کیے اندھا دھند یا مقررہ معاوضہ حاصل

کرنے کی خاطر ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔

صلیبی سامراج کی دُوسری بڑی خواہش یہ رہی ہے۔ اور اس میں بھی مسلمان مؤرخوں نے ان کی تائید کی ہے۔ کہ کسی طرح یہ ثابت کیا جائے کہ مصر پر فرانس کا حملہ خود مصریوں کے لیے باعثِ خیر و برکت تھا۔ اسی حملہ کی وجہ سے وہ اپنے خوابِ غفلت سے بیدار ہُوئے اور ہوش میں آکر اس قابل ہُوئے کہ نشاۃِ ثانیہ، قوت اور ترقی کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں اور تہذیبِ جدید کے وسائل سے استفادہ کر سکیں۔ مختصر یہ کہ اس حملہ نے انھیں ہمہ جہت خیر سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ فراہم کر دیا تھا۔

پہلے مفروضہ کا جواب ہم نہیں دیں گے کیونکہ ہم پر تو مسلمان ہونے کی تہمت ہے بلکہ خود مسیحی اپنی کتابوں میں اس مفروضے کو رد کر رہے ہیں جو شخص چاہے ان کی تصانیف میں یہ بات دیکھ سکتا ہے۔

"روم لانڈو" (ROM LANDOW) ایک ایسا اہم عصر عیسائی مصنف ہے جو بیسویں صدی میں رہتا ہے اور اس صدی کے حوادث و واقعات کو بیسویں صدی کی اس عقلیت کی عینک سے دیکھتا ہے جس کے بارے میں ہمارے مشرق میں کہا جاتا ہے کہ اس عقلیت نے مذہبی خرافات اور مذہبی تعصب سے نجات دلا دی ہے اور مغرب ہماری طرح پس ماندہ جامد اور دقیانوسی نہیں رہا۔ یہی مصنف اپنی کتاب "المیہ مراکش" (THE MOROCCAN DRAMA) میں شمالی افریقہ کے واقعات کا ذکر کرتے ہُوئے صفحہ ۳۱۰ پر لکھتا ہے:

"فرانسیسی پارلیمان کے ممبر "گلوسٹرمین" اور "تیزر" کہتے ہیں کہ "موسیو بیڈو" وزیر خارجہ فرانس مراکش میں ہونے والے حالیہ واقعات کو مسیحیت اور اسلام کی جنگ خیال کرتے ہیں چنانچہ جب ان دونوں ممبروں نے وزیر خارجہ کو اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کی کہ مراکش میں تخریبی کارروائی کو روکنے کے لیے کوئی اقدام کیا جائے تو اس نے کہا کہ یہ صلیب و ہلال کی جنگ ہے۔"

وہ لوگ جو استعمار کی چکّی میں پس رہے ہیں اور آنکھیں بند کیے بے سوچے سمجھے مغرب کی تعریف میں رطب اللسان ہیں مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں غور کریں کہ اس بیسویں صدی میں بھی جو بقول ان کے مذہبی خرافات اور تعصب سے آزادی کا دور ہے فرانس اپنے مقبوضہ علاقوں کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور فیصلہ کریں کہ کیا وہ سچ کہتے ہیں؟ اور کیا وہ اب یہی کہتے رہیں گے کہ فرانسیسیوں میں صلیبی رُوح صرف اٹھارویں صدی تک تھی جبکہ وہ ابھی مذہبی تعصب سے آزاد نہیں ہوتے تھے؟

یہ تو فرانس کے بارے میں تھا۔ اب باقی صلیبی یورپ کے متعلق سُنیے!

"ولفرڈ کانٹ وِل اسمتھ" اپنی کتاب "الاسلام فی تاریخ المعاصر" (جس کا پہلے بھی حوالہ دیا جا چکا ہے) کے صفحہ نمبر ۱۰۹، ۱۱۰ پر لکھتا ہے:

"کارل مارکس کے سرگرمِ عمل ہونے اور اشتراکیت کے وجود میں آنے سے پہلے مغربی تہذیب کے حقیقی اور واحد حریف جن سے اسے اپنی پوری تاریخ میں مقابلہ درپیش رہا صرف (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) (مرادِ اسلام) ہی تھے۔ اس سلسلے میں جو بات بطورِ خاص قابلِ ذکر ہے یہ ہے کہ یہ مقابلہ کس قدر سخت تھا اور کس قدر بسا اوقات اسلام ایک حقیقی اور بہت بڑا خطرہ بن کر سامنے آتا رہا۔

اسلام کا حملہ بیک وقت حرب و عقیدہ کے دونوں میدانوں میں تھا اور بہت ہی جاندار تھا۔ بلاشبہ اگر مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ سب کچھ حق اور قرینِ صواب معلوم ہوگا اور ان کے مطابق اسلام کی توسیع جس طرح پہلے ہوتی رہی ہے اب بھی ایک قدرتی اور حتمی بات ہے۔ لیکن جب اُن لوگوں کی نظر سے دیکھا جائے جو دائرۂ اسلام سے باہر ہیں جو اسلام کے متعلق ایسی کوئی رائے نہیں رکھتے اور اسلام کی یہ توسیع جن کے خلاف ہے۔ تو معاملے کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ دراصل اسلام کی یہ توسیع زیادہ تر مغرب کے خلاف رہی ہے۔ اس لیے کہ مسیحیت نے ہی اس نئی طاقت سے محفوظ رہنے کے لیے رُومی

سلطنت کی خوبصورت ترین جاگیریں بیک وقت ہاتھ سے کھو دیں تھیں کیوں کہ پوری رومی سلطنت کے ضائع ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور باوجودیکہ قسطنطنیہ پر مصر و شام کی طرح مسلمان فوجوں کا مکمل قبضہ نہ ہو سکا تھا۔ پھر بھی ایک طویل عرصہ تک اس پر دباؤ مسلسل جاری رہا۔ اور پھر ۱۴۵۳ء میں جب اسلامی فتوحات کی دوسری لہر اٹھی تو قسطنطنیہ بھی ان کے قبضے میں چلا گیا۔ مزید برآں ۱۵۲۹ء میں قلب یورپ میں واقع "ویانا" کا محاصرہ کیا گیا جس پر دباؤ مسلسل جاری رہا۔ پھر کچھ مدت کے بعد جبکہ ابھی پہلے محاصرے کو کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا ۱۶۸۳ء میں دوبارہ محاصرہ کیا گیا۔

۱۹۴۸ء میں چیکوسلاواکیہ کا روس کے قبضے میں چلا جانا عصر حاضر کے گھبرائے ہوئے یورپ کے لیے ہرگز اس قدر خوف و ہراس کا باعث نہ تھا جس قدر کہ مسلمانوں کی خوفناک اور عظیم قوت کی کئی صدیوں تک جاری رہنے والی یلغار۔ جو نہ کبھی رکتی تھی اور نہ کمزور پڑتی تھی۔ اور جسے پے در پے فتوحات حاصل ہوتی جا رہی تھیں۔

جو صورت حال اشتراکیت کی ہے بعینہ اقدار و افکار کی دنیا میں اسلام کا خطرہ اور اس کی فتوحات کے امکانات موجود ہیں۔ اس لیے کہ اسلام جس طرح خارج کی دنیا میں آگے بڑھ رہا ہے اسی طرح نظریات کی دنیا میں بھی اس کا حملہ جاری ہے۔

"یقیناً اس نئے عقیدے (اشتراکیت) نے مسیحی عقاید کے بنیادی اصولوں کو ناپسندیدہ بنانے میں بہت زیادہ کردار ادا کیا ہے جبکہ یہ اصول یورپ کے لیے ایک وقیع عقیدے کی حیثیت رکھتے تھے اور یورپ نے انہی کے گرد اپنی تہذیب کا تانا بانا ایسی حالت میں بنا تھا کہ اسلامی خطرہ پوری قوت اور شدت کے ساتھ بڑھا چلا آ رہا تھا اور تقریباً نصف مسیحی دنیا پر پوری طرح چھا چکا تھا۔ لیکن صرف اسلام ہی وہ واحد مثبت قوت ہے جس نے مسیحیت سے لاکھوں افراد چھین لیے جو نئے دین میں داخل ہو کر اس پر ایمان لے آئے۔

اور یقیناً یہ بات مشکوک ہے کہ اہل مغرب جتنے کہ وہ لوگ بھی جنھیں مطلقاً یہ ادراک

ہی نہیں ہے کہ وہ اس قسم کے معاملات میں الجھے ہوئے ہیں کبھی طویل مدت سے جاری رہنے والی اس بنیادی اور اہم کشمکش کے آثار پر غلبہ پا سکتے ہیں یا ان صلیبی لڑائیوں کے اثرات سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے پوری دو صدیاں تلخ ترین مظالم سے پُر عقیدے کی جنگ کے نذر ہو گئیں"۔

کیا مندرجہ بالا اقتباس دیکھ لینے کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمان اہل قلم جو استعمار کی چکی میں پس رہے ہیں اور احمقانہ انداز میں آنکھیں بند کیے مغربی مصنفین کی تائید کر رہے ہیں سچ کہتے ہیں؟۔ اس اقتباس کی روشنی میں وہ محسوس کریں کہ یورپ عالم اسلام کو آج تک کس نظر سے دیکھتا ہے۔ اور استعمار کے پس پردہ کون سے عوامل اور محرکات کارفرما ہیں؟

اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ یورپ نے (جو اقتصادی عوامل و محرکات سے شدید طور پر متاثر رہا ہے) اپنی سامراجی کوششیں صرف عالم اسلام تک ہی محدود نہیں رکھیں بلکہ مشرق و مغرب کے تمام علاقوں کو غصب کرنے کے لیے جہاں جہاں بھی ممکن ہو سکا اپنے استعماری جال پھیلائے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کے پیش نظر ہمیں اس دوسری حقیقت سے غافل نہیں ہو جانا چاہیے اور وہ یہ کہ اسلامی ممالک پر یورپی استعمار کی یورش کا حقیقی اور بہت گہرا محرک دراصل صلیبی جذبہ تھا اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی کارروائیوں کے لیے ان استعمار پرستوں کے ذہن پر صرف اقتصادی جذبے کی کارفرمائی ہی نہ تھی اور اس کی بہت ہی وزنی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے اسلامی دنیا میں صرف اقتصادی استحصال ہی نہیں کیا بلکہ اسلامی اصولوں کو ختم کرنے اور دلوں پر سے اس کی گرفت کمزور کرنے کے لیے مسلسل اور پے در پے انتہائی جدوجہد کی ہے جبکہ ہندوستان میں ہندو مذہب اور چین میں بودھ مذہب سے کوئی تعرض نہیں کیا حالانکہ ان دونوں مذاہب کی افرادی قوت مسلمانوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہے۔

یہ تو تھا پہلا نکتہ جس کا تعلق مصر پر فرانس کے حملہ میں پوشیدہ عزائم سے ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ عزائم اب قارئین پر پوری طرح واضح ہو چکے ہوں گے اور اسی سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہو گی کہ مصر میں مسلمانوں پر اسلامی شریعت کی جگہ (مغربی) شہری قوانین مسلط کرنے اور شرعی قوانین کو صرف شخصی احوال تک محدود کر دینے کا راز در اصل کیا تھا۔

دوسرے نکتے کا تعلق اس مزعومہ "خیر و برکت" سے ہے جو اس حملے کے نتیجے میں مصر اور دنیائے اسلام کو حاصل ہوئی اور جس کے بارے میں خود مسلمانوں کے دلوں .. میں بے سر و پا کہانیاں اور فرضی باتیں گردش کر رہی ہیں اور جدید مسلمان مورخ بھی ان کے فریب میں مبتلا ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مصر میں علمی تحریک بیدار ضرور ہوئی لیکن اس کا حقیقی سبب وہ صدمہ تھا جو شکست سے مصریوں کو پہنچا تھا۔ اس بیداری کے فوائد کو فرانسیسی سامراج کے غاصبانہ حملے کے کھاتے میں کسی طرح نہیں ڈالا جا سکتا۔ یہ بات تو پوری طرح سمجھ میں آتی ہے کہ اہلِ یورپ کہیں کہ مصر میں علمی تحریک کا سہرا ان کے سر ہے لیکن ہم جب تاریخ مرتب کرنے لگیں تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ان کے عزائم کو بھی مدنظر رکھیں۔ کیا واقعی فرانس کی غرض (اس حملہ سے) یہ تھی کہ اہلِ مصر مہذب اور تعلیم یافتہ ہو جائیں یا اس کا مقصد یہ تھا کہ مصر کا تشخص ختم ہو جائے اور وہ فرانس کے رنگ میں رنگ جائے؟ یہی کوشش فرانس نے تیونس، الجزائر، مراکش بلکہ ہر اُس ملک میں کی ہے جہاں فرانسیسی استعمار کے ناپاک قدم پہنچے ہیں۔

اب اس کا دوسرا پہلو لیجیے۔ اسلامی مصر پر فرانس کے اس حملہ کا عملاً کیا نتیجہ برآمد ہوا؟ کیا مصر کی یہ بیداری اس کے طبعی اصولوں، اس کی حقیقی بنیادوں، روایات اور مقدسات پر اُستوار ہوئی یا یہ بیداری ان سب چیزوں کو منہدم کر کے اس مقصد سے پیدا کی گئی تھی کہ مصر کے وجود میں سے ایک ایسا ملک تخلیق کیا جا سکے جس کا اسلام

سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ مورخین ایسے تاریخی حقائق بھی فراموش کر دیتے ہیں جو محض محتمل الوقوع ہی نہیں بلکہ وقوع میں آ چکے ہیں۔

کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ محض فرانسیسی حملہ ہی اس خیر و برکت کا واحد ذریعہ تھا جس کی وجہ سے مسلمان بیدار ہوئے، ان کی جہالت، جمود اور پس ماندگی دور ہوئی اور ان میں از سرِ نو زندگی کی وہ حرارت پیدا ہوئی جس کی وجہ سے یہ تمام ادارے وجود میں آئے جو مدارس اور یونیورسٹیوں کی شکل میں طلبا کی تعلیم کا ذریعہ ہیں۔

اسلامی تاریخ میں ایسی ناپسندیدہ صورتِ حال کبھی پیدا نہیں ہوئی کہ مسلمان بگاڑ اور خرابی کی وجہ سے قریب المرگ ہوں اور اللہ تعالیٰ ان میں ایسا کوئی شخص پیدا نہ فرمائے جو انھیں خوابِ غفلت سے بیدار کرے اور حیاتِ تازہ سے ہمکنار کرے۔ ان مورخین کا وہابی تحریک کے متعلق کیا خیال ہے جس کا مقصد اسلام کو ان گندی خرافات سے پاک کرنا تھا جو مسلمانوں میں اسلام کے نام پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اسی طرح ان کی مہدوی تحریک کے بارے میں کیا رائے ہے جس کا مقصد شمالی مصر کے ان مسلمانوں کو جو برائے نام خلافتِ عثمانیہ سے وابستہ تھے انگریز کی غلامی سے آزاد کرانا اور پورے عالمِ اسلام کی گردن سے ترکوں کا جوا اُتارنا تھا بعینہٖ ان کے علاوہ دوسری اسلامی تحریکوں کے بارے میں یہ مورخین کیا کہیں گے جن سب کا مقصد اسلامی معاشرے میں ہونے والے اجتماعی، سیاسی، فکری اور روحانی مظالم کو دور کر کے اسلام کو بیدار کرنا تھا تاکہ وہ پھر بروئے کار آ کر انسانیت کی قیادت کے لیے اپنا رول ادا کر سکے۔

کیا ان لوگوں (مورخین) کا خیال ہے کہ نشاۃ و بیداری صرف وہی ہوتی ہے جو فرانسیسی یا غیر فرانسیسی مغربی استعمار کے ہاتھوں ہو۔

بہ حال۔ یہ تصورات اس زہر کی نشان دہی کر رہے ہیں جو صلیبی استعمار نے مسلمانوں

کے دلوں میں اُتار دیا ہے۔

ہم کسی تاریخی حقیقت کو جھٹلانا نہیں چاہتے۔ یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں اسی دن سے شکست خوردگی کا احساس پیدا ہو گیا تھا جس دن انھوں نے میدان جنگ میں شکست کھائی تھی لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ اسلام ختم یا زوال پذیر ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ سامراجیوں کو عالم اسلام پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے پوری ایک صدی تک بڑی سخت جدوجہد کرنا پڑی اور پھر مسلمانوں کے دلوں سے اسلام کو محو کرنے کے لیے مزید ایک صدی تک کوشش کرتے رہے، اس کے باوجود انھیں کامیابی نہ ہوئی کیوں کہ استعمار کی ان کارروائیوں کے پہلو بہ پہلو متعدد اسلامی علاقوں میں احیائے اسلام کی لہر بار بار اٹھتی رہی جو اسلامی عقیدے کے انتہائی طاقت ور ہونے کی دلیل ہے اور اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ تاریخ کے مختلف اَدوار میں اسلام کو جتنے بھی مہلک حادثات سے دوچار ہونا پڑا یہ دین ان کا مقابلہ کرنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم صلیبی سامراج کی ان کوششوں کا جائزہ لیں گے جو اس نے اسلام کو دلوں سے ختم کرنے کے لیے بڑے تدبّر و فراست اور بہت ہی پُرفریب انداز سے کی ہیں۔ اور اس سلسلے میں ہم خود سامراجیوں اور ان کے مشنریوں کے اقوال بطور ثبوت پیش کریں گے کیونکہ اس سلسلے میں "مستند ہے ان کا فرمایا ہوا"۔

محمد علی جب ترکوں کی طرف سے مصر کا والی بن کر آیا تھا تو اس کے دل میں ترکی خلافت سے علیحدہ ہو کر خود مختار ہونے کی خواہش پوشیدہ تھی لیکن اس نے اس فرانسیسی اثر و نفوذ کی طرف نہ کوئی توجّہ دی اور نہ اسے اہم سمجھا جو اس کے ساتھ ساتھ مصر میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔

اس نے اس طرف اس لیے دھیان نہیں دیا کہ فرانس اسے مدد اور مشورے دے رہا تھا اور اس کے لیے شہری اور فوجی تنصیبات لگا رہا تھا اور بہت سی نئی چیزیں مثلاً پل، بحری بیڑے اور اسلحہ کے کارخانے بنا رہا تھا اور یہ سب کام اتنے بڑے تھے جن کے لیے مصر کے مالی ذرائع اور افرادی قوت ناکافی تھی اور یہ کام فرانس نے مصر کو فائدہ پہنچانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے ان صلیبی مقاصد کی تکمیل کے لیے سرانجام دیے تھے جو وہ فوجی حملے سے حاصل نہ کر سکا تھا۔

فرانس محمد علی کو پال پوس کر ترکی خلیفہ سے علیحدہ ہو جانے پر اکسا رہا تھا تاکہ اس طرح ایک بہترین "مثال" قائم ہو جس کی باقی عالم اسلام میں تقلید کی جائے اور پورا عالم اسلام ٹکڑے ٹکڑے ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ جائے اور مغرب کے لیے ان پر اپنا اثر جمانا اور ایسی اصلاحی تحریکیں شروع کرنا آسان ہو جائے جن کے ذریعے اسلامی بنیادوں کو تباہ کر کے مسلمانوں کو بے دین بنایا جا سکے تاکہ وہ گھات میں بیٹھے ہوئے صلیبی اقتدار کے آگے سرنگوں ہو جائیں اور مغرب کو اپنے زہریلے کینہ و عناد کی تسکین کا موقعہ مل جائے۔

اس مقام پر ایک ایسا مغالطہ ہے جس کی وجہ سے مسلمان اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں اور تاریخی شواہد کے حوالے سے کہتے ہیں کہ خلافت عثمانیہ کی حالت آخری دور میں بہت بگڑ چکی تھی، اور وہ صرف ظلم و جبر کا ایک ذلیل پیکر بن کر رہ گئی تھی جس کے اندر بیہودگی، جہالت اور ظلم کے سوا کچھ نہ تھا اور اسے اسلامی رُوح سے کوئی واسطہ باقی نہ رہا تھا جب یہ بات صحیح ہے تو کیوں نہ خلافت کے خلاف بغاوت کو ایک بہترین خدمت شمار کیا جائے جس کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ایک قابل تحسین و تقلید فیصلہ قرار دیا جائے۔

اس دَور میں خلافت کی جو کیفیت ہو چکی تھی اس کے باوجود کیا محض اس بنا پر کہ وہ اسلام کی علامت ہے پوری دُنیا کے مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ اس سے وابستہ رہیں

جبکہ اسی علامت کی وجہ سے وہ ذلت ونکبت اور پس ماندگی اور جمود میں پڑے ہوئے تھے اور ہر اصلاح کے راستے کی رکاوٹ بن رہے تھے۔ اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ خلافت کو ختم کرنے کے پس پردہ سامراجیوں کا انتہائی بُرا مقصد پوشیدہ تھا۔ یعنی ان کا مقصد عالم اسلام کے باہمی رابطے کو منقطع کر کے عالم اسلام کو پارہ پارہ کرنا تھا۔ تو کیا ہم محض اس لیے خلافت کے مظالم خاموشی سے برداشت کرتے رہتے اور پس ماندگی اور جمود کے ہاتھوں خود کو ہلاک کر لیتے کہ خلافت سے بغاوت سامراجیوں کے ناپاک مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنے گی؟

دراصل یہی وہ بات ہے جس سے مسلمان مغالطے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ مغالطہ از خود نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کا سبب وہ پُرفریب باتیں ہیں جو صلیبی سامراج نے ان کے ذہنوں میں ٹھونس دی ہیں اور ان کو دلوں میں بٹھانے کے لیے بہت کوشش کی ہے اور وہ یہ کہ صرف دو ہی صورتیں ممکن تھیں یا تو خلافت کے رسوا کن مظالم کو برداشت کیا جائے اور یا علیحدگی کی تحریک کے ذریعہ خلافت سے نجات حاصل کر لی جائے اور پھر جو ہو سو ہو، خواہ ان علیحدہ ہونے والے ممالک میں مغربی اثرو نفوذ کا تسلط ظالم خلافت اور جابر ترکوں سے چھٹکارا پانے کی قیمت بن جائے۔ اس سے بڑھ کر سامراجی پروپیگنڈا یہ کہہ کر مسلمانوں کے ذہن میں مزید مغالطہ پیدا کر رہا ہے کہ مغربی نفوذ کا مطلب دراصل اصلاح و تعمیر اور تہذیب و تعلیم ہے اور یہ چیزیں مسلمانوں کے لیے خیروبرکت کا باعث ہیں جن کی راہ میں خلافت کا باقی رہنا حائل تھا۔

گویا دوہرا مغالطہ پیدا کر دیا گیا!

پہلے تو یہ بات ہی غلط ہے کہ صرف دو ہی صورتیں ممکن تھیں یعنی یا تو مظالم خلافت برداشت کیے جائیں یا پھر علیحدگی کی تحریک کے تباہ کن طریقہ سے دُنیائے اسلام کے باہمی رابطے منقطع کر کے اسے پارہ پارہ کر دیا جائے۔

دُوسرے یہ خیال بھی انتہائی غلط ہے کہ مسلم ممالک میں اصلاح احوال کا واحد طریقہ صلیبی اثرو نفوذ کا درآنا تھا۔

اس ضمن میں ہم تحریک وہابیت اور تحریک مہدویت کا نام لیں گے جنھیں اس سے پہلے کہ ان کا اثر اسلامی دُنیا تک پہنچے صلیبی سامراج نے کچل ڈالا اور اس مقصد کے لیے محمد علی اور اس کی اولاد کو براہ راست یا بالواسطہ استعمال کیا۔ یہ دونوں تحریکیں مکمل اصلاح کی تحریکیں تھیں۔ ان میں سے پہلی تحریک (وہابی تحریک) کا مقصد پورے عالم اسلام کو ظلم اور بیہودگی سے پاک کرنا اور مسلمانوں کو ترکوں کی غلامی اور اس غلامی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے جمود اور بے حسی سے چھٹکارا دلانا تھا۔ اسی طرح دوسری تحریک (مہدوی تحریک) شمالی علاقوں (مصر و سوڈان) کو انگریزوں کی غلامی سے اور باقی دنیائے اسلام کو ترکانِ عثمانی کی باج گزاری سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ دونوں تحریکوں کی کوشش یہ تھی کہ مسلمان پاکیزہ اسلامی فضا میں زندگی گزاریں اور اپنا قابلِ تعریف تاریخی کردار پھر سے ادا کرنے کے قابل ہو سکیں تاکہ عالم اسلام پارہ پارہ ہونے سے بچ جائے اور مغربی سامراج کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ اسلامی دُنیا کے اندر فساد برپا کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ صلیبی یورپ نے ان دونوں تحریکوں کے خلاف ترکی کے اعلیٰ حکام کو (جن میں سے اکثر پہلے ہی صلیبیوں کے ایجنٹ تھے) بھڑکانے میں تیزی دکھائی اور محمد علی اور اس کے بیٹوں کو ان تحریکوں کا دشمن بنا کر یکے بعد دیگرے دونوں کو ختم کرنے پر لگا دیا اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے ہر اس علیحدگی پسندی کی تحریک کی پُشت پناہی شروع کر دی جس کی بنیاد اسلام کی بجائے علاقائی عصبیت ہو۔

یہی وہ نکتہ ہے جس پر غور کرتے وقت مسلمان کی سوچ اغیار سے مختلف ہونی چاہیے کہ اصل معاملہ محض ظلم کے باقی رکھنے یا ظلم کے ختم کرنے کا نہیں ہے بلکہ ہمارے مسئلے کا حل یہ تھا کہ ظلم اس طرح ختم ہو کہ عالم اسلام کی وحدت اور اسلامی عقیدے کی قوت برقرار رہے اور

اسی حل سے صلیبی سامراج پہلے بھی انکار کرتا رہا ہے اور اب بھی منکر ہے۔

مصر، شام اور لبنان میں فرانسیسی اثر و نفوذ اس قدر بڑھ گیا اور ان ممالک میں ایک ایسا مکتبۂ فکر پیدا ہو گیا جس کے ذریعہ ایسے لوگوں کی پرورش کی جاتی تھی جو فرانس کو اپنا وطنِ ثانی اور مادرِ مہربان خیال کرنے لگے اور کہنے لگے کہ مصر تو کبھی مشرق کا حصہ تھا ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے بحر "متوسط ابیض" کا (جس پر فرانس واقع ہے) حصہ رہا ہے اور مصر کے فکری، روحانی اور ثقافتی رابطے مشرق کی بجائے ہمیشہ بحیرہ ابیض کی قوموں سے رہے ہیں گویا مصر کا اسلام سے (جو بحر ابیض کے کناروں کی بجائے جزیرہ نمائے عرب کے وسط سے آیا ہے) کبھی کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔

پھر اسی ذہن و فکر کے لوگ صلیبی سامراجیوں کی کوششوں سے کلیدی مناصب پر فائز کر دیے گئے تاکہ وہ نئی نسل کا رُخ بھی فرانس کی طرف موڑ سکیں یا کم از کم اسے اسلام سے بیگانہ کر دیں۔

لیکن اس کے باوجود فرانس اپنے تمام وہ خواب حقیقت نہ بنا سکا جن کی خاطر اس نے نپولین کے زمانے میں مصر پر قبضہ جمایا تھا اور جن کی اس کے بعد بھی طویل عرصہ تک امید لگائے رہا۔ کیونکہ انگریزوں کی حرص و طمع فرانسیسیوں سے تیز اور جرأت مند ثابت ہوئی چنانچہ ۱۸۸۲ء میں مصر برطانیہ کی غلامی میں چلا گیا اور ستر سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک برطانیہ کا غلام رہا۔

یہی وہ دور ہے جب برطانوی حکومت کے زیرِ سایہ مصر میں صلیبی سرگرمیاں بڑے پیمانہ پر شروع ہوئیں اور اسی زمانے میں فرانس شام، لبنان، تیونس، الجزائر اور مراکش میں اپنے صلیبی عزائم کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل رہا اور اس دور کے آخری ایام میں باقی ماندہ اسلامی ملکوں پر پرتگال، ڈنمارک، ہولینڈ اور اطالیہ کا صلیبی سامراج چھاتا چلا گیا اور اسی دور میں مسلمانوں کے دلوں سے اسلام کو محو کرنے کے لیے بہت منظم، سوچی سمجھی اور باقاعدہ پالیسی مرتب کی گئی۔

لیکن سامراجیوں کے لیے اسلام کو ختم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لیے کہ اسلامی عقاید کی جڑیں مسلمانوں کے دلوں میں اتنی گہری اور پختہ تھیں کہ ان عقاید کو یکسر ختم کرنے یا ان کی گرفت کو کمزور کرنے کے لیے انھیں انتہائی مشقت اور جد و جہد کی ضرورت تھی اور حقیقت یہ ہے کہ صلیبی سامراجیوں نے اس مقصد کے لیے سخت جد و جہد کی اور بالآخر کامیاب ہو گئے۔

سامراجیوں کو اس مقصد میں کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب وہ اپنی زہریلی پالیسی کے تحت ایسی کئی نسلیں تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جو اسلام کے بارے میں اس کے نام سے زیادہ کچھ نہ جانتی تھیں اور جنھیں یہ بات ذہن نشین کرا دی گئی تھی کہ اسلام بندے اور رب کے مابین تعلق کا نام ہے اسلام کو انسان کے عملی برتاؤ اور معاشرہ اور زندگی کے معاملات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

یا اسلام کے متعلق ان کے خیالات یہ تھے کہ اسلام جمود، دقیانوسیت، اور پس ماندگی کے سوا کچھ نہیں ہے اور قافلۂ حیات کا ساتھ دینے کے لیے اسلام سے لاتعلق ہو جانا ضروری ہے۔

سامراجی سازشیں

اب ہم سامراجی زعیموں اور مشنریوں کے وہ اقوال اور تاریخی واقعات پیش کرتے ہیں جن کا بیان ہم نے شروع کیا تھا۔

۱۸۸۲ء میں برطانیہ کے وزیرِ اعظم مسٹر گلیڈ سٹون دار العوام میں قرآن مجید ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوئے اور ممبروں سے مخاطب ہو کر انھوں نے کہا کہ "جب تک یہ کتاب مصریوں کے پاس موجود رہے گی ہم ان کے علاقوں میں نہیں جم سکتے"۔ یہ جملہ اپنے مفہوم میں اتنا واضح ہے کہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ گویا یہ شخص بخوبی جانتا تھا کہ ان عوام کی قوت کا منبع قرآن کریم یعنی اسلام ہے اور یہی وہ پہاڑ ہے جس سے سامراج ٹکرا رہا

ہے اور جو اس کے لیے مصیبت بنا ہُوا ہے اس لیے اس پہاڑ کو پارہ پارہ کرنا اور راستے سے ہٹانا ضروری ہے۔ (گویا یہ تھی مرکزی پالیسی) اور اس کے بعد ہی ڈنلپ کو جو برطانیہ کے کلیۃ الٰہیات کا فارغ التحصیل تھا مصر میں نظامِ تعلیم کی تشکیل کیلیے بھیجا گیا۔

اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم

کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ کسی مسلمان ملک کا نظامِ تعلیم ایک پادری تشکیل دے۔ ہاں! یہ واقعہ ہے اور یہ اس لیے کیا گیا کہ یہ شخص مسلمانوں کے ہاتھ سے اس "کتاب کریم" کو چھین لے اور ملک میں سامراج کو قدم جمانے کا موقع مل سکے۔

چنانچہ ڈنلپ نے یہ نظامِ تعلیم پالیسی کے مطابق تیار کیا اور اس کے مطلوبہ نتائج آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ بالآخر برآمد ہو کر رہے۔ دراصل برطانیہ کی پالیسی ہر جگہ یہی رہی ہے۔

مصر میں علم کا مرکز "ازھر" تھا۔ مسجد اور جامعہ ازہر میں مصر ہی نہیں پُورے عالم اسلام سے طالبان علم آیا کرتے تھے تاکہ اس کے قرب و جوار میں رہنے کی سعادت حاصل کریں اور اس میں تعلیم پا کر علم و عرفان کے سجادہ بن کر نکلیں۔

اس زمانہ میں "الازہر" اسلام کی زندگی بخش تعلیمات کے لیے کوئی زیادہ بہتر جگہ نہ تھی۔ ترکوں کے آخری دَور میں تمام اسلامی معاملات جس جمود و زوال کا شکار تھے وہی حال اس کا بھی تھا۔ یہاں بھی زندگی کے آثار مفقود تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ "ازہر" کی اصلاح و احیاء اور اسے شدید جہالت سے نکال کر "روشن خیال" بنانے کے لیے چند مخصوص قسم کی کوششیں بھی کی جا رہی تھیں۔

اس بحث میں پڑے بغیر کہ محمد عبدہٗ اور ان کے متبعین کی قیادت میں جس مکتب فکر نے یہ اصلاحی کوشش کی وہ صحیح تھا یا غلط اور وہ نتائج جو اس کوشش سے متوقع تھے برآمد ہوئے

یا نہیں ایک بات بالکل واضح ہے کہ صلیبی سامراج "الازہر" کو ختم کرنے پر تُلا بیٹھا تھا۔ کیونکہ فی الواقع نہ سہی کم از کم مسلمانوں کے خیال میں ازہر اسلامی عقیدے کی پناہ گاہ تھا اور ایک ایسا مرکزِ اسلام تھا جس کی طرف مشرق و مغرب کے مسلمانوں کی نظریں اٹھتی تھیں اور اسی بنا پر یہ مقام مسلمانوں کی فکری، مادی اور رُوحانی وحدت کا منبع تھا اور صلیبی نقطۂ نگاہ سے اس کا وجود ختم ہو جانا چاہیے تھا۔

"الازہر" کو ختم کرنے کے لیے برطانوی سامراج نے اپنی طے شدہ پالیسی (جس کے لیے اسے کسی غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے) اختیار کی جلد بازی سے نہیں بلکہ سُست رفتار اور عیارانہ چالوں سے کام لیا۔ کیونکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ فرانسیسیوں نے اپنے حملہ کے دوران "الازہر" میں گھوڑے باندھنے کی جو حماقت کی تھی اس کی وجہ سے عوام کے جذبات بھڑک اٹھے تھے اور یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ مشنریوں نے اسلامی عقاید پر جو براہِ راست حملے کیے تھے ان کا نتیجہ بھی برعکس نکلا تھا۔ مسلمانوں نے خطرہ بھانپ لیا تھا اور مزید دامنِ اسلام سے وابستہ ہو گئے تھے۔

انگریز سامراج اس قسم کی حماقت ہرگز نہیں کر سکتا تھا!

انگریز ہمیشہ صرف ایسی عیارانہ چالیں چلتا ہے جو سُست رفتار لیکن مقصد کے لحاظ سے کامیاب ہوتی ہیں۔

"ڈنلپ" نے مصر میں سرکاری پرائمری سکول کھولے جن میں علوم مدنیت اور سامراجیوں کی زبان "انگریزی" کی تعلیم دی جاتی تھی اور ان تعلیمی اداروں میں ایسے کلرک تیار کیے جاتے تھے جو انگریزوں کے جاری کردہ دفاتر اور اداروں میں ملازم رکھے جاتے تھے اور انھیں روپوں کی بجائے اشرفیوں میں تنخواہ دی جاتی تھی۔

لوگوں کو بہکانے کے لیے اتنا لالچ ہی کافی تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد جامعہ ازہر میں تعلیم کے لیے صرف وہی غریب اور مفلس لوگ اپنی اولاد کو بھیجنا پسند کرتے جو سرکاری

سکولوں کے اخراجات برداشت کرنے سے قاصر تھے کیوں کہ سرکاری سکولوں میں تعلیم پانے کی صورت میں سامراجی آقاؤں کی زبان (انگریزی) سیکھ لینے کی وجہ سے ہر شخص کو بہتر مستقبل نظر آتا تھا۔

ابتدا میں مسلمانوں نے اپنی اندرونی اسلامی حس کے زیر اثر ان مدارس کے خلاف اس بنا پر احتجاج کیا کہ کافروں کے ان سکولوں میں نہ تو قرآن مجید پڑھایا جاتا ہے اور نہ دینی تعلیم دی جاتی ہے لیکن پھر تمام صاحب استطاعت لوگ "الازہر" سے منہ موڑ کر سرکاری سکولوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور سرکاری سکولوں کے یہ تعلیم یافتہ لوگ ایک نیا طبقہ بن کر ابھرے۔ جن کا امتیاز ایک تو یہ تھا کہ یہ اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے دوسرے سرکاری ملازمتوں کی وجہ سے انھیں معاشرے میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ علاوہ ازیں سامراجی طاقت بھی مختلف مواقع پر علانیہ یا خفیہ طریقے سے ان کی حوصلہ افزائی کرتی رہتی تھی۔

ان مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے طلبا درحقیقت تعلیم یافتہ افراد نہیں تھے بلکہ جیسا کہ ہم نے کہا صرف کلرک بنتے تھے جو کلرکی کے علاوہ اور کوئی کام نہ کر سکتے تھے۔ ان کا کام صرف اتنا تھا کہ انگریز افسروں سے احکام حاصل کریں اور پوری نیاز مندی، مرعوبیت اور احترام کے ساتھ ان کے احکام بجا لائیں۔

بات یہ نہیں ہے کہ انگریز اس زمانے میں صحیح تربیت کے اصولوں اور حقیقی تعلیم کے طریقوں سے ناواقف تھے۔ اور نہ انگلستان کے مدارس اس غلامانہ انداز کی تعلیم دیتے تھے جیسی مصر کے ان سکولوں میں دی جاتی تھی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ "ڈنلپ" نے جو پالیسی مرتب کی تھی اس کا مقصد ہی تعلیم یافتہ افراد پیدا کرنا نہ تھا بلکہ ایک ہی مقصد تھا ایسے غلام تیار کرنا جنھیں حکم دیا جائے اور وہ صرف اطاعت کریں اور اشارۂ ابرو پر رقص کرتے رہیں، دوسرا مقصد جو ظاہر نہیں کیا جاتا تھا بلکہ آہستہ آہستہ اپنے یقینی ہدف کو حاصل کر رہا تھا وہ تھا لوگوں کی توجہ "الازہر" سے ہٹانا تاکہ بالآخر یہ ادارہ ابتری کا شکار ہو کر ایسے حالات

سے دوچار ہو جائے کہ زندہ نہ رہ سکے۔

ان سکولوں میں استاد ایک ہی انداز میں اور ایک ہی کتاب پڑھاتا تھا اور ظاہر ہے کہ انگریز اس بات سے ناواقف نہ تھے کہ ایک ہی محدود طریقے کی تعلیم طالب علم کے ذہن و فکر کو محدود کر کے اس میں سے افکارِ تازہ کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے کیونکہ افکارِ تازہ اشیاء کو مختلف صورتوں میں اور نئے نئے زاویوں سے دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں اس طرح ذہن جولانی اور تبدیلی کا عادی ہو جاتا ہے اور نئے افکار و خیالات اور نئی چیزیں تخلیق کرتا ہے۔

اسی زمانے میں انگلستان کے سکول اپنے انگریز طلبا کو جو تربیت دے رہے تھے اس کا انداز یہ تھا کہ ایک موضوع کے بارے میں مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کی جائیں تاکہ طلبا میں علم حاصل کرنے کا شوق نشوونما پائے اور افکارِ نو اور ایجاد و اختراع کی صلاحیت اجاگر ہو۔ پھر امتحان میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ رٹی رٹائی باتیں نہ پوچھی جائیں بلکہ مطالعے سے حاصل شدہ معلومات کے متعلق سوالات کیے جائیں۔ لیکن مصر میں انھوں نے فکر و شعور پر پہرے بٹھا دیے تھے کہ مبادا کسی میں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

مصر کے ان سرکاری سکولوں میں انگریز پرنسپل اپنے گرد تقدس اور رعب کا ایک ایسا ہالہ بنائے رکھتا تھا جیسے وہ لائقِ پرستش معبود ہو۔ اس کا رعب طلبا کے دلوں پر طاری رہتا تھا اور وہ اس سے تعظیم و تقدیس سے پیش آتے تھے اور یہ تربیت کا نہیں بلکہ دلوں میں غلامی کی کشت کاری کا بہترین ذریعہ تھا۔

ان مدارس میں طلبا کے ذہنوں میں یہ بات بٹھائی جاتی تھی کہ مصر ایک پس ماندہ ملک ہے کیونکہ وہ ایک زرعی ملک ہے نہ اس میں کوئلہ ہے نہ لوہا اور یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں کوئی صنعت فروغ نہیں پا سکتی جبکہ صنعت ہی ترقی کا زینہ ہے۔ اور یہ ذہن نشین کرایا جاتا تھا کہ یورپ بالخصوص انگلستان ترقی یافتہ اور صنعتی ملک ہے اس لیے کہ وہاں

لوہا اور کوئلہ موجود ہے۔

ان مدارس میں دینی علوم اور قرآن مجید کی تعلیم کے سلسلے میں ایسے متفرق اجزا اور وہ بھی مسخ کر کے پڑھائے جاتے تھے جو مفید ہونے کی بجائے نقصان دہ ثابت ہوتے تھے۔ جبکہ مشنری سکولوں میں (جن کو سامراج اپنی سرپرستی میں زیادہ سے زیادہ مستحکم بنا رہا تھا) دن کی ابتدا سکول کے گرجوں میں مسیحی نماز اور ولولہ انگیز دعاؤں سے ہوتی تھی اور اس نماز اور دعا میں مسلمان بچوں کو جبراً شریک کیا جاتا تھا اور یہ مذہب ان کے وجدان و شعور میں ایسے وقت اور ایسی حالت میں جاگزین ہو جاتا تھا جب ذہن تر و تازہ ہوتا تھا اور مستقبل کی نئی زندگی ان کو خوش آمدید کہہ رہی ہوتی تھی اور سرکاری سکولوں میں قرآن اور دینی تعلیم کا پیریڈ تعلیمی پروگرام کے آخری اوقات میں رکھا جاتا جب بچے تھک چکے ہوتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح سکول کے ناپسندیدہ قیدخانہ سے نکل کر کھلی سڑکوں یا گھر کے آرام دہ ماحول میں پہنچ جائیں۔ پھر قرآن مجید کے جو حصے پڑھائے جاتے تھے ان کی تعلیم کسی کمانے کھو کتنے بوڑھے استاد کے سپرد کی جاتی تھی جو زندگی کی ڈھلتی چھاؤں اور فنا ہوتی ہستی تصویر بن کر بچوں کے سامنے آتا تھا۔ چنانچہ بچوں کے ذہن میں دین کے بارے میں عجز و ننا اور بڑھاپے کا تصور ابھرتا تھا اور دل میں نفرت و حقارت پیدا ہوتی تھی۔

بعد ازاں ڈنلپ کی تعلیمی پالیسی میں مزید توسیع کی گئی اور کئی ثانوی سکول کھولے گئے تاکہ وہ صلیبی طوفان کو مزید آگے بڑھا سکیں۔ یہ سکول بھی تمام معاملات میں اسی ڈگر پر چل رہے تھے۔ ان میں بھی حقیقی اسلام کے متعلق کچھ نہیں پڑھایا جاتا تھا۔

ان سکولوں میں اسلامی تاریخ سے متعلق جو کچھ پڑھایا جاتا تھا اس کا انداز کچھ اس قسم کا تھا:

۱۔ اسلام صرف ایک بت پرست قوم کے لیے آیا تھا۔ یہ لوگ چونکہ بتوں کی پرستش کرتے تھے اس لیے انھیں اسلام نے خدائے واحد کی عبادت کی دعوت

دی تھی۔

۲۔ یہ لوگ اپنی لڑکیوں کو زندہ گاڑ دیا کرتے تھے اسلام نے انھیں ایسا کرنے سے منع کیا۔

۳۔ پھر اسلام نے بت پرستوں کو مسلمان بنانے کے لیے جنگ کی دعوت دی اور لڑائیاں ہوئیں اور کچھ فتوحات حاصل ہوئیں۔ ان فتوحات کے نتیجہ میں اسلام ان علاقوں میں بھی پھیل گیا جن میں آج موجود ہے۔ چنانچہ اسلام کا رول ختم ہو چکا ہے اس کے سامنے اب کوئی مقصد نہیں اور نہ کوئی ایسی مہم باقی ہے جسے اسلام عملی زندگی میں سرانجام دے۔

گویا ایک تو اب نہ وہ بت پرست موجود ہیں جن کو اسلام نے خدائے واحد کی عبادت کی دعوت دی تھی۔ (اس ضمن میں سامراج افریقہ اور ایشیا کے بہت بڑے بڑے خطوں کو نظروں سے اوجھل کر جاتا ہے)۔

دوسرے۔ اب کوئی قوم لڑکیوں کو بھی زندہ دفن نہیں کرتی کہ اس کارِ بد سے روکنے کے لیے دعوتِ اسلام کی ضرورت ہو۔

تیسرے۔ باقی رہ گئی تبلیغِ اسلام یعنی جہاد۔ سو نئے بین الاقوامی سیاسی حالات کی بنا پر اب وہ بھی ختم ہو چکا ہے اور جدید دور میں اس کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

اسلامی تعلیم کے سلسلہ میں ان سکولوں کا انداز یہ تھا لیکن یہ امور کہ:

۱۔ اسلام ایک کائناتی قوت ہے جو انسانوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کے لیے اس زمین میں ابھری تھی۔

۲۔ اسلام انسانی زندگی کا ایسا نظام ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسان کو خیر و فلاح کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

۳۔ اسلام اس زمین کی ایک فعال قوت ہے۔

۴ — اسلام ایک تہذیب ہے جو روئے زمین پر ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک چھائی رہی۔

۵ — اسلام ایک علمی تحریک ہے جس نے پوری دُنیا کو روشنی عطا کی اور اسی نور سے بہرہ یاب ہو کر یورپ نے اپنی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔

۶ — اسلام اقتصادی تنظیم اور معاشرتی عدل و انصاف ہے۔

۷ — اسلام ایک تحریکِ آزادی ہے جس نے فرد کے ضمیر کو خرافات اور غیر اللہ کی غلامی سے آزاد کیا اور پوری انسانیت کو اس ظلم سے نجات دلائی جو معاشرتی نظام کی خرابی یا اشخاص کے بگاڑ کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

۸ — اسلام اللہ کا نازل کردہ قانون ہے تاکہ زمین پر اللہ کی حکمرانی ہو اور لوگ احکامِ الٰہی کی اطاعت کریں اور صرف اسی قانون کو اپنی زندگیوں پر نافذ کریں۔

ان امور میں سے کوئی بات بھی ان سکولوں کے طلبا کو نہیں پڑھائی جاتی تھی بلکہ صرف یہ بتایا جاتا تھا کہ اسلام زیادہ تر صرف چند عبادتوں کے مجموعے کا نام ہے جنھیں اگر انسان ادا کرلے تو گویا دین کی طرف سے عاید تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جاتا ہے۔

یا پھر بچوں کے ذہنوں میں اسلام کے بارے میں شبہات پیدا کرنے کے لیے اسے فکری، روحانی، اجتماعی اور سیاسی مظالم کا مجموعہ بنا کر پیش کیا جاتا تھا تاکہ ایک طرف وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر اور بے وزن چیز بن کر رہ جائے اور دوسری طرف یہ ظاہر ہو کہ اسلام صرف جمود، رجعت پسندی اور پس ماندگی کی علامت ہے جس سے بزور نجات حاصل کرنا اور دین کی گالی سے خلاصی پانا ضروری ہے۔

اس کے برعکس انھی سکولوں میں یورپ کے بارے میں پڑھایا جاتا تھا کہ یورپ قوت ہے، تہذیب اور علم کا گہوارہ ہے، معاشرتی انصاف آزادی اور اخوت و مساوات کا مرکز ہے وہ ایسا ترقی یافتہ علاقہ ہے جو ہر میدان میں ہمیشہ آگے بڑھتا جائے گا۔ حقیقی معاشرتی نظام وہی

ہے جو آج یورپ میں ہے اور صحیح اقتصادی نظام بھی وہی ہے جو یورپی فکر کی ایجاد ہے۔ سب سے اچھا دستوری نظام وہ ہے جو مغربی تجربات کے نتیجہ میں منجھ کر تیار ہوا ہے۔ انسانی حقوق کا چارٹر انقلاب فرانس نے مرتب کیا تھا اور جمہوریت وہ ہے جو انگریز عوام نے اختیار کر رکھی ہے اور تہذیب کی بنیادیں رومی شہنشاہیت نے رکھی تھیں۔

ان سب تعلیمات کا مقصد یہ ذہن نشین کرانا تھا کہ یورپ ایک ناقابلِ عبور بحرِ ذخار ہے جس کے سامنے اسلام کی حیثیت ایک حقیر ندی کی سی ہے۔ گویا اگر زندہ رہنا ہے تو اس بحرِ ذخار کی غلامی اختیار کی جائے۔

خاور ڈنلپ کی تعلیمی پالیسی صرف اسی حد پر آکر نہیں رک جاتی ہے بلکہ چونکہ عربی زبان شروع سے اور ہمیشہ مسلمانوں کے خیال میں خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب، مذہب سے گہرا تعلق رکھتی ہے اس لیے اس کی تحقیر و تذلیل ضروری تھی تاکہ اس کے نتیجہ میں دین کا جو مفہوم اس کے ساتھ وابستہ ہے وہ بھی ذلیل و حقیر ہو۔ اور اس مقصد کے لیے ضروری قرار پایا کہ عربی کے استاد کی شخصیت کو انتہائی ذلیل و حقیر حالت میں رکھا جائے اسی لیے جس سکول میں انگریزی، جغرافیہ، تاریخ اور حساب کے اساتذہ کو بارہ اشرفی ماہانہ مشاہرہ دیا جاتا تھا جو اس دور میں ایک ایسی خوش حال زندگی کی ضمانت ہوتا تھا جس میں گھر بار اور ہر قسم کے سازوسامان کی سہولت میسر آسکے۔ اسی سکول میں ان کے ساتھ اتنا ہی کام کرنے والے عربی کے استاد کو ان سے کئی حصے کم یعنی تقریباً چار اشرفی تنخواہ دی جاتی تھی۔

اور اس پالیسی کے نتیجہ میں اساتذہ کے دونوں طبقات کی حالت میں انتہائی اور غیر معمولی فرق و امتیاز پیدا ہو گیا۔

انگریزی کا استاد سکول اور معاشرے میں قابلِ احترام تھا، معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے اس کا مرتبہ بلند تھا وہ اچھے خاندانوں میں شادی کر سکتا تھا اور اپنے بچوں کی صاف ستھری اور اعلیٰ فضا میں پرورش کرتا تھا۔

جبکہ عربی کا استاد پس ماندہ، احساس کمتری کا شکار اور حال ست تھا۔ اس کا معاشرتی اور اقتصادی مقام بھی گر گیا تھا اس کیلیے کسی شریف خاندان میں شادی کرنا ممکن نہ تھا اور اپنے بچوں کی پرورش فقر و فاقہ اور ذلت و نکبت کے ماحول میں کرنے پر مجبور تھا۔ لوگ اسے ہر مقام پر حقارت و نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور کہا جاتا تھا۔ آہ! بے چارہ عربی ٹیچر! اور یہ ذلت و حقارت کی چوٹ فی الواقع صرف ٹیچر کی ذات تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عربی زبان اور دینِ اسلام کی تذلیل و تحقیر ہو رہی تھی۔

صرف اتنا ھی نھیں ھُوا

بلکہ صلیبی سامراج کے ساتھ ساتھ پوری اسلامی دُنیا میں مسیحی مشنری ممکن حد تک وسیع پیمانے پر پورے زور اور شدت سے اسلامی مطالب و مفاہیم کو لوگوں کے دلوں سے مٹانے اور ان کی بجائے مسیحی اور بالعموم یورپی تصورات دلوں میں بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

میرے سامنے اس وقت "الغارۃ علی العالم الاسلامی" (LA CONQUETE DU MONDE MUSUL MAN.) نامی کتاب ہے۔ اس کتاب کی بے باکی اور اسلامی دُنیا میں اس وقت کے سرگرم عمل سامراجی اور مشنری منصوبے اور ان کے زہریلے اثرات (جو اب تک دلوں پر اثر انداز ہیں) دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔

یہ بہت ہی بڑا المیہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ اتنا بڑا فریب کیا گیا اور انھیں پتہ ہی نہ چلا۔ وہ حماقت سے قہقہے لگاتے رہے یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے احمقانہ خود ساختہ توکل کیے بیٹھے رہے۔ اور اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ آج ہم پورے عالم کے ساتھ کیے جانے والے مکر و فریب کے نتائج اور اس کے زہریلے اثرات مسلمانوں کے فکر و عمل اور اخلاق و روایات میں ظاہر ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں پھر بھی ہمارے بعض بھائی اس کو "ترقی" سمجھ کر اور پھلتے پھولتے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں اور بعض مسلمان اس پر محض کفِ افسوس مل رہے

جاتے ہیں۔

یہ دونوں گروہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان ناگزیر تبدیلیوں سے بالآخر عالمِ اسلام کو دوچار ہونا تھا اور اس سے بچنا یا کسی وقت اس کو روک دینا ممکن ہی نہ تھا۔

مسلمانوں کے یہ دونوں گروہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سامراجی اور مشنری گزشتہ دو صدیوں میں مسلمانوں کے عقل و ذہن کے ساتھ کیا کچھ کر گزرے ہیں۔

یہ درست ہے کہ "عالمی تغیرات" خواہ ہم انھیں ترقی خیال کریں یا تنزل ایک عظیم قوت ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی دنیا تک اس تغیر کے اثرات کا پہنچنا بہرحال ناگزیر تھا ہم آئندہ صفحات میں "عالمگیر لہریں" کے عنوان سے ایک مستقل باب میں ان اثرات پر گفتگو کریں گے مگر یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ صلیبی سامراج نے اسلامی دُنیا کو عالمگیر انقلاب کی اس لہر سے دوچار کرنے کی حد درجہ کوشش کی ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کا کوئی موقع نہیں دیا اور نہ اس بات کی گنجائش رہنے دی کہ عالمِ اسلام ان عالمی تغیرات کی لہروں کے آگے جھکنے کی بجائے ان سے مقابلے کے لیے کوئی مناسب مُدبرانہ موقف اختیار کر سکے۔

اگر اسلامی دُنیا اپنی سابقہ قوت و سربلندی کی مالک ہوتی تو یقیناً وہ اس عالمی تغیر کے مقابلے میں سپر اندازی اور بے چارگی کی بجائے دُوسرا موقف اختیار کرتی، احمقوں کی مانند اس ترقی پر خوش نہ ہوتی اور مغرب سے آنے والی ہر چیز کو ہر مرض کی دوا سمجھ کر اس کی طرف نہ لپکتی جبکہ ہو سکتا ہے کہ وہ چیز شفا بخش ہونے کی بجائے خود بیماری پیدا کرنے کا سبب ہو۔ اگر عالمِ اسلام اپنی عظمتِ رفتہ کا مالک ہوتا تو ذلت کے ساتھ اس کے آگے جھکنے کی بجائے پُوری انسانیت کے لیے نجات دہندہ کا موقف اختیار کرتا اور انسانیت کو اس جہنم میں گرنے سے بچاتا جو منہ کھولے تغیر کے اس تمام سرمایہ کو بھسم کرنے کے لیے تیار ہے جو انسانیت نے اپنی طویل تاریخ میں حاصل کیا تھا۔

ہم یہ تفصیلات کسی دوسرے موقع پر بیان کریں گے اس وقت اس ہوش رُبا کتاب میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ پوری کتاب ہی اس قابل ہے کہ اس کا ایک ایک فقرہ پڑھا جائے۔ اس کا ہر جملہ انتہائی ہولناک سامراجی عزائم کی جھلک لیے ہوئے ہے۔

یہ کتاب دراصل فرانس سے شائع ہونے والے مجلّہ "عالم اسلامی" کا ایک مخصوص شمارہ ہے جو آج سے پچاس سال قبل عالم اسلام میں پروٹسٹنٹ مسیحی مشنریوں کی کارکردگی پر روشنی ڈالنے کے لیے مرتب کیا گیا تھا۔ اس کا مقدمہ مجلّہ کے اس وقت کے ایڈیٹر مسٹر "لوشاتلیہ" (A·LE CHATELIER) نے لکھا تھا جس میں وہ فرانس کے کیتھولک عیسائیوں کو اکساتا اور ان کی ہمت بڑھاتا ہے کہ وہ تبلیغی کام میں سرگرم عمل ہوں اور اس میدان میں پروٹسٹنٹ فرقہ کی نمایاں کامیابی کا ذکر کر کے انھیں غیرت دلاتا ہے۔ اس مجلّہ میں اس موضوع کا عنوان "اسلامی دُنیا کی فتح" (LA CONQUETE DU MONDE MUSULMAN) رکھا گیا ہے۔ مسٹر "مساعد الیافی" اور مسٹر "محب الدین خطیب" نے اسی زمانہ میں جب رسالہ شائع ہوا تھا اس کا عربی ترجمہ کر کے جریدہ "المؤید" میں قسط وار شائع کیا تھا۔ پھر تقریباً تیس سال پہلے ۱۳۵۰ھ میں انھوں نے ان قسطوں کو یکجا کر کے مصر سے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔

یہ کتاب جو اتنا عرصہ قبل طبع ہوئی ہے اس میں تالیفِ کتاب سے تقریباً ایک صدی پہلے کی مشنری کارکردگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ خاص طور پر ان بڑی بڑی مشنری کانفرنسوں کی رپورٹیں پیش کی گئی ہیں جو ۱۹۰۶ء میں قاہرہ میں، ۱۹۱۰ء میں انگلستان کے شہر اڈنبرگ میں اور ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کے شہر لکھنؤ میں منعقد ہوئیں۔ یہ کتاب اسلامی دنیا میں مشنری رجحانات اور ان کے ذرائع و مقاصد کا انتہائی مکمل جائزہ پیش کرتی ہے۔ یہ چیز کہ کتاب کو مرتب ہوئے ایک طویل مدت گزر چکی ہے اس کی قدر و قیمت کو کم نہیں کرتی بلکہ درحقیقت

اسی چیز نے اس کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے کہ اس میں ان بُنیادی منصوبوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو بہت پہلے اس مقصد کے لیے بنائے گئے تھے اور کام کر رہے تھے اور آج ان منصوبوں کے نتائج سامنے آگئے ہیں اور ابھی تک اپنا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ اس کتاب سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مُسلمانوں کے خلاف صلیبی سامراج جو کچھ کرتا رہا ہے اس کی تاریخ کتنی طویل ہے اور دورِ حاضر بھی پورے کا پورا اسی کشمکش کی آماجگاہ بنا ہوا ہے جس کو فرانس کے مسٹر "پیڈو" کی قسم کے لوگ کھلم کھلا صلیب و ہلال کا معرکہ قرار دیتے ہیں اور کچھ دُوسرے افراد چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

"شاتلیہ" مقدمہ میں لکھتا ہے (اصل عبارت نقل کرتے ہوئے کہیں کہیں ہم نے قوسین میں تشریحی نوٹ دیے ہیں اور بعض جملوں کی اہمیت واضح کرنے کے لیے خط کشیدہ کیا ہے)

ہم نے ۱۹۱۰ء میں اسی مجلّہ (فرانس کے مجلّہ عالم اسلامی) میں اسلامی سیاست (یعنی اسلام اور اسلامی دنیا میں کیا پالیسی اختیار کی جائے) پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا۔ فرانس کو چاہیے کہ مشرق میں کام کرتے وقت ہر اقدام سے پہلے اپنے کام کی بنیاد عقلی تربیت کے قواعد کو بنائے تاکہ کام کا دائرہ وسیع ہو سکے اور دُور رس نتائج حاصل ہوں۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں صرف ان اعمال پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے جو مشنری پادری سرانجام دے رہے ہیں کیونکہ ہمارے کثیر الاغراض مقاصد کے لیے پادریوں کی کوششیں ناکافی ہیں۔ یہ مقصد صرف فرانسیسی یونیورسٹیوں میں دی جانے والی تعلیم سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس طریقہ تعلیم میں قوتِ ارادی پر مبنی علمی اور عقلی وسائل سے کام لیا گیا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ یہی طریقہ تعلیم عملاً نافذ ہو کر فرانسیسی یونیورسٹی کی تعلیمات کو اسلام میں پھیلا سکے گا۔

اس طرح شاتلیہ واضح طور پر اس وسیع مقصد کا اعلان کر رہا ہے جو سامراجی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ یہ تھا کہ اسلام میں فرانسیسی یونیورسٹی کی تعلیمات کو داخل کر دیا جائے!

ملاحظہ کیجیے !

ہمیں دنیائے اسلام کے عوام سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ اگر ان کا اسلامی فکر کی بنیاد پر تعمیر شدہ ڈھانچہ منہدم ہوگیا تو وہ کوئی نیا نظام یا نیا ڈھانچہ اپنے لیے تشکیل دے لیں گے۔ اس لیے کہ جب اسلامی فکر میں بتدریج ضعف پیدا ہوگا اور اس ضعف کے لازمی نتیجہ کے طور پر جو ٹوٹ پھوٹ اور اضمحلال واقع ہوگا اس کا قدرتی تقاضا یہ ہوگا کہ زندگی کے ہر پہلو میں فساد برپا ہو جائے اور دینی روح اپنی بنیاد سے ہٹ جائے اس صورت میں کسی نئی تعمیری شکل کے وجود میں آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

یہ اقتباس اتنا واضح ہے کہ اس پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں۔ گویا مغربی زبانوں کی تعلیم کا مقصد اسلامی تعلیمات کے بارے میں اعتقاد کو کمزور کرنا ہے اور صلیبی سامراج کو یہ بات معلوم ہے کہ اگر ایک مرتبہ اسلامی عقائد میں ضعف پیدا ہوگیا تو اس کا لازمی نتیجہ ٹوٹ پھوٹ اور اضمحلال ہی ہوگا۔ اور یہی مقصود وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔

یہاں اس سوال کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب سامراج مغربی زبانوں کی تعلیم سے ہی اسلامی افکار و اعتقاد کو کمزور کرنے کا کام لے رہا ہے تو کیا ہم ان زبانوں کی تعلیم حاصل کرنا ترک کر دیں جبکہ موجودہ دور میں علم و معرفت کے حصول کا واحد ذریعہ صرف یہی زبانیں ہیں؟

ہرگز نہیں! زبانوں کی تعلیم ممنوع قرار دینا اور علم و معرفت کے دروازوں کو بند کر دینا ایسی حماقت ہوگی جسے کوئی صاحبِ عقل اپنے لیے پسند نہیں کر سکتا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے ارادے اور اختیار سے ان زبانوں کو سیکھیں نہ کہ جس طرح سامراج ہمیں ان کی تعلیم دینا چاہتا ہے۔ ہمیں مغربی زبانوں کو اسی انداز میں سیکھنا چاہیے جس طرح دورِ اوّل کے مسلمانوں نے یونانی، سریانی، فارسی اور ہندی زبانوں کو سیکھا تھا جو اس دور میں علم و معرفت کی زبانیں تھیں۔ ان زبانوں کے پڑھنے سے ان کے عقیدے پر کوئی زد نہیں پڑی تھی۔ بلکہ انھوں نے ان کو سیکھا ہی اس

لیے تھا کہ اپنے دین و عقیدے کی خدمت کریں اور علم و معرفت کے ہر شعبہ تک اس کی روح سرایت کر جائے۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب صرف مسلمان علماء ہی پوری دنیا میں اصحابِ علم مانے جاتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی تھے۔

ایک سوال اور بھی ہے جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ صلیبیوں نے اسلامی دنیا میں جو کچھ کیا اس میں اور جو کچھ مسلمانوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں کیا تھا ان دونوں میں آخر فرق کیا ہے؟

یہ درست ہے کہ مسلمانوں نے بھی اپنی زبان "عربی" تمام مفتوحہ علاقوں میں عام کر دی تھی بلکہ انھوں نے یہ ممالک فتح ہی اشاعتِ اسلام کے لیے کیے تھے لیکن صلیبیوں کا طریق کار اور مسلمانوں کے طرزِ عمل میں بہت فرق ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں نے کبھی خفیہ حیلوں کے ذریعہ لوگوں کے فکر و عقیدہ کو بدلنے اور انھیں مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ اسلام کی دعوت ایک کھلی دعوت تھی جس میں نہ کوئی فریب تھا اور نہ جبر و اکراہ۔

"سر تھامس آرنلڈ" جو ایک بہت ہی قابلِ اعتماد مسیحی مصنف ہے اپنی کتاب "الدعوۃ الی الاسلام" (THE PREACHING OF ASLAM) کے صفحہ ۴۸ پر اسی ضمن میں لکھتے ہیں:

(یہ اقتباس کتاب کے عربی ترجمہ سے لیا گیا ہے جو حسن ابراہیم حسن وغیرہ نے کیا ہے)

مسیحی عربوں اور عرب مسلمانوں کے درمیان جو دوستانہ تعلقات موجود تھے۔ ان کے پیشِ نظر ہم یہ فیصلہ بآسانی کر سکتے کہ مسیحیوں کے اسلام قبول کرنے کا قطعی موثر عامل قوت و جبر نہ تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مسیحی قبائل سے معاہدے کیے تھے جن میں آپؐ نے عیسائیوں کی حفاظت اور ان کے مذہبی معاملات میں آزاد رہنے کا ذمہ لیا تھا اور اہلِ کلیسا کے قدیم حقوق و اختیارات پورے امن و اطمینان سے بحال رکھنے کا وعدہ فرمایا تھا۔

پھر آگے چل کر صفحہ ۵۱ پر لکھتا ہے: "پہلی صدی ہجری کے فاتح مسلمانوں اور ان کی آئندہ

نسلوں نے مسیحی عربوں کے ساتھ کس قدر دینی سالمیت اور بے تعصبی کا سلوک کیا تھا اس کی جو مثالیں اُوپر بیان ہو چکی ہیں ان کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل صحیح ہوگا کہ جن مسیحی قبائل نے اسلام قبول کیا تھا انھوں نے ایسا اپنی مرضی اور آزاد ارادے سے کیا تھا۔ آج کل جو عیسائی عرب علاقوں میں رہتے ہیں اس مذہبی آزادی اور رواداری کی واضح شہادت دیتے ہیں۔

پھر مفتوحہ علاقوں میں عربی زبان کی ترویج و اشاعت کا حقیقی مقصد صرف باہم مسالمت کا راستہ ہموار کرنا تھا کہ لوگ نئے دین سے واقف ہو جائیں اور اگر انھیں پسند آئے تو بلا جبر و اکراہ اپنی مرضی سے اسے قبول کر لیں۔[1]

اس کا مقصد نہ تو دوسرے مذاہب کو زک پہنچانا اور ختم کرنا تھا اور نہ اس طریقِ کار کا نتیجہ یہ نکلا کہ دینی رُوح جڑ بنیاد سے اس طرح ختم ہو جائے کہ وہ کسی دوسری شکل میں بھی ظاہر نہ ہو، جیسا کہ "شاتلیہ" نے صلیبی سامراج کا مقصد بتایا ہے۔ بلکہ مُسلمانوں کا مقصد تو صحیح دینی رُوح کو قوی تر اور فعال صورت میں پیدا کرنا تھا اور یہی اس کا نتیجہ برآمد ہُوا۔ یہ فرق جو ہم نے بیان کیا ہے

---

[1] بہت سے اسلام دشمن مغربی مُصنفین مُسلمانوں کی جنگی فتوحات کو اسلام کی بزورِ شمشیر اشاعت کے ساتھ الجھا کر غلط انداز میں پیش کرتے ہیں اور بعض مسلمان بھی اس معاملہ میں مغالطہ کھا جاتے ہیں۔ جبکہ دونوں باتوں میں واضح فرق ہے۔ اس لیے کہ پہلی بات یعنی مسلح فتوحات تو مسلمانوں کو حاصل ہوئیں، یہ ایک واقعہ ہے لیکن اسلام کی اشاعت تلوار کے زور پر کبھی نہیں ہوئی۔ جیسا کہ مسیحی مصنف "آرنلڈ" کے اس اقتباس سے ثابت ہوتا ہے جو ہم نے نقل کیا ہے۔ دونوں باتوں میں فرق یہ ہے کہ مسلمانوں نے جنگیں لڑ کر فتوحات اس لیے حاصل کی تھیں تاکہ وہ مادی رکاوٹ ختم ہو جائے جو لوگوں کے پُرامن طریقے سے اسلام کے سمجھنے اور اپنی مرضی سے اسلام قبول کرنے کی راہ میں حائل ہے اور جو مملکت، نظمِ حکومت اور لشکر کی شکل میں متشکل ہے۔ مگر فتح کے بعد مسلمانوں نے لوگوں کو قطعاً آزاد چھوڑ دیا تھا کہ وہ جو عقیدہ چاہیں اختیار کر لیں۔ اور اگر چاہیں تو مسلمانوں کے زیر سایہ رہتے ہوئے یہودی یا عیسائی رہیں یا نیا مذہب اختیار کر لیں۔ دراصل اسلام کا حقیقی مقصد رُوئے زمین پر اسلام کا عادلانہ معاشرتی نظام قائم کرنا تھا۔ تاکہ سب انسان اس کے زیر سایہ رہیں۔ خواہ اسلام قبول کریں یا نہ کریں۔ (مصنف)

معاملہ کی نوعیت سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

اب ہم پھر اقتباسات (بلکہ انھیں اعترافات کہنا زیادہ مناسب ہے) نقل کرتے ہیں۔

مسٹر شاتلیہ اپنے مقدمے میں لکھتا ہے:

"ہم پھر اپنی بات کی طرف آتے ہیں۔ مشنریوں کی تخریبی کارگزاریوں کے نتائج کے بارے میں کتنا ہی اختلاف رائے کیوں نہ ہو، مگر یہ حقیقت ہے کہ اسلامی اعتقادات کا خاتمہ ان ہی لوگوں کی ان کوششوں کا نتیجہ ہے جو وہ نصرانیت کے فروغ کے لیے سرانجام دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اسلامی دُنیا کی سیاسی تقسیم نے بھی مغربی تمدن کے لیے راہیں ہموار کر دی ہیں اس لیے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب اسلام سیاسی اعتبار سے کمزور ہو جائے گا تو پھر اسے مغربی تہذیب کے جال میں پھنسنے میں کچھ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

مندرجہ بالا مختصر سا فقرہ دو بہت بڑی حقیقتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔

پہلی حقیقت تو وہی ہے جو پہلے بھی بیان ہو چکی ہے لیکن یہاں ذرا زیادہ واضح انداز میں پیش کی گئی ہے اور وہ یہ کہ جتنی بھی کوششیں کی گئی ہیں سب کا مقصد صرف نصرانیت کو فروغ دینا ہے۔

اس نقطۂ نگاہ سے نہیں کی گئیں کہ تہذیب و تمدن پُوری انسانیت کی میراث ہے اور قوم و وطن کی حدبندیوں سے آزاد ہے اس لیے اسے اتنا عام ہونا چاہیے کہ سب انسان اس سے فائدہ اٹھائیں۔ جیسا کہ مشرق کے بعض بے وقوف مسلمان خیال کرتے ہیں کہ سامراج اسلامی دنیا میں ترقی کے جو کام سرانجام دے رہا ہے وہ انسانی تہذیب کی خدمت کے لیے انجام دے رہا ہے۔ یہی گمان ان لوگوں کا ہے جو سامراج کے ایجنٹ ہیں یا سامراجی زہر سے متاثر ہو گئے ہیں۔ یہ تمام کوششیں واضح طور پر اور علانیہ صرف عیسائیت کے فروغ کی خاطر کی جا رہی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کا مقصد اسلامی اعتقادات کی جڑیں کھوکھلی کرنا ہے۔

دُوسری حقیقت یہ ہے کہ اسلامی ممالک کی سیاسی تقسیم مغربی تمدن (جو شاتلیہ کے مطابق نصرانی

تہذیب ہے اسکے لیے راہیں ہموار کر دے گی۔

یہاں سیاسی تقسیم سے شاتلیہ کی مراد یہ ہے کہ اسلامی دنیا نیم آزاد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو جائے اور وہاں کے حکمران بھی نیم آزاد یا خود مختاری کے خواہاں ہوں تاکہ سامراج ان کا سرپرست بن کر ان سے شیطانی کام لیتا رہے۔

درحقیقت یہی تفریق وانتشار ان کی حقیقی غرض وغایت تھی کیونکہ اس طرح اسلامی دنیا کو جنگی اور مذہبی حیثیت سے فتح کرنا بمقابلہ اس کے کہ ساری اسلامی دنیا ایک وحدت ہو (خواہ کتنی ہی کمزور ہو) بہت زیادہ آسان ہے۔

اس بات سے ہمارے اس نظریہ کی جو پہلے بھی ہم کئی بار دہرا چکے ہیں، تائید ہوتی ہے کہ صرف یورپی تمدن (جسے ہمارے دانشور تہذیبی ارتقا کہنا پسند کرتے ہیں) بذاتِ خود اس قابل نہ تھا کہ وہ تنہا اسلامی دنیا میں یہ تمام خرابی اور فساد پیدا کر سکتا۔ اگر سامراج اسلامی عقائد کی بیخ کنی کے لیے ان بے شمار وسائل و ذرائع سے اس پر مسلسل ضربیں نہ لگاتا جو ان کے مشنریوں اور سامراجی کارندوں کو حاصل ہیں۔

ان اقتباسات کے نقل کرنے سے ہمارا مقصد جو کچھ ہے اس کی وضاحت کے لیے شاتلیہ کے اس مقدمہ میں بہت کافی مواد موجود ہے۔ اس مقدمہ کے پڑھنے سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ گزشتہ ایک صدی میں اسلام کو ختم کرنے کیلیے کیا کیا مکروفریب کیے گئے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ صلیبی دنیا اسلامی ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات میں اب بھی بدستور اسی قسم کے مکروفریب سے کام لے رہی ہے، صرف ایک فرق پڑا ہے اور وہ یہ کہ اب کوئی شخص فرانس کے موسیو "پیڈو" کے علاوہ پہلے کی طرح اپنے ان اغراض کا اظہار و اعلان نہیں کرتا۔ اس کے برعکس ہر ممکن ذریعہ سے ان مقاصد کی نہ صرف پردہ پوشی کی جاتی ہے بلکہ بعض اوقات ان سے کُلیتاً انکار کیا جاتا ہے اور اس کے دو سبب ہیں۔

ایک — ان کی پُرفریب چالیں نہ صرف یہ کہ واقعتاً اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کر چکی

ہیں بلکہ ان کے مؤثرات ابھی تک اپنا کام کر رہے ہیں اس لیے ان کی پردہ داری بہتر ہے تاکہ وہ بتدریج اپنا کام کرتی رہیں اور ان کے متعلق کوئی بحران پیدا نہ ہو جس کی وجہ سے مسلمان متنبہ ہو کر ان کے مقاصد کی حقیقت کو سمجھ جائیں۔

دوسرے — صلیبی سامراج کو داخلی طور پر مسلمانوں میں سے ایسے مددگار مل گئے ہیں جن کی روح سامراجیت زدہ اور ذہن زہر آلود ہیں، اور سامراج نے اب اسلامی عقاید کی شکست و ریخت کا کام انہی مسلمانوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ اب سامراج اس کام میں کھلی مداخلت نہیں کرتا جس طرح نصف صدی پہلے مضطربانہ انداز میں خود سامنے آ کر کیا کرتا تھا۔ اب اسے پوری اسلامی دنیا میں اہلِ قلم، مفکرین، راہنماؤں، دانشوروں، حریت پسندوں اور ترقی پسندوں میں سے ہر جگہ اپنے معاون و مددگار مل گئے ہیں جو اثر و نفوذ رکھتے ہیں اور سامراج نے اب تخریب کی مہم انہی لوگوں کے سپرد کر دی ہے اور خود چین سے بیٹھ کر اپنی چالوں کو آسانی سے کامیاب ہوتے دیکھ کر خوش ہو رہا ہے اور مسلمانوں کی غفلت و حماقت کی ہنسی اُڑا رہا ہے۔

"شاتلیہ" کے تحریر کردہ مقدمہ سے جو اقتباسات ہم نے نقل کیے ہیں ان سے سامراجی عزائم کی حقیقت پوری طرح کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور اصل مضمون جس کا نام اس نے "اسلامی دنیا کی فتح" رکھا ہے، میں سے مزید اقتباسات کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن چونکہ اصل کتاب میں ان اقدامات کی مفید تفصیل بیان کی گئی ہے جو صلیبی سامراج نے مسلمانوں کے دلوں سے اسلامی عقاید کی بیخ کنی اور اسلام سے منحرف کرنے کے لیے کیے ہیں اور یہ ایسی تفصیلات ہیں جو اگرچہ ان کے مقاصد کے سلسلے میں ہماری معلومات میں تو کچھ زیادہ اضافہ نہیں کرتیں لیکن ان سے ان کے ذرائع اور وسائل کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوتی ہیں اس لیے اب ہم اصل کتاب میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں:

کتاب "غزو العالم الاسلامی" سے چند اقتباسات

یہ کتاب مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

۱۔ مشنری پروگرام کی تاریخ۔

۲۔ قاہرہ کی ۱۹۰۶ء میں منعقد ہونے والی مشنری کانفرنس۔

۳۔ ۱۹۱۰ء کی اڈنبرگ کی مشنری کانفرنس۔

۴۔ جرمنی میں منعقد ہونے والی سامراجیوں کی کانفرنس۔

۵۔ ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ میں ہونے والی مشنری کانفرنس۔

۶۔ مشنری وفود کی مادی تنظیم۔

۷۔ مستقبل میں مشنریوں کے مقاصد اور آرزوئیں۔

ان تمام ابواب میں اور بھی بہت سی تفصیلات بیان کی گئی ہیں لیکن ہم یہاں صرف ان عبارتوں کے اقتباسات پیش کریں گے جو بہت ہی واضح طور پر ان کے عزائم نمایاں کرتی ہیں۔

کتاب کے صفحہ ۳۳ پر ۱۹۰۶ء کی قاہرہ کانفرنس کے زیر عنوان یہ سطور نظر آتی ہیں:

"جو لوگ "ازہر" اور اسی قسم کی دوسری درسگاہوں میں مشرقی طریقہ پر تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کے بارے میں کانفرنس کے ایک رکن نے قدیم "ازہر" کے پوری اسلامی دنیا میں اثر و نفوذ اور مسلم نوجوانوں کی اس میں دلچسپی پر روشنی ڈالی۔ اور اس کے ایک ہزار سالہ اثرات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ سالہا سال سے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ "ازہر" میں عربی زبان کی تعلیم دوسری درس گاہوں کے مقابلہ میں بہت بہتر اور پختہ ہوتی ہے نیز ازہر کے فارغ التحصیل دینی علوم میں بڑی اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ پھر ازہر میں تعلیم کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور یہ ادارہ مفت تعلیم دینے پر پوری طرح قدرت و استطاعت رکھتا

ہے کیونکہ اس کے اوقاف کی آمدنی دو سو پچاس تنخواہ دار اساتذہ ملازم رکھنے کی کفیل ہو سکتی ہے۔"

پھر سوال کے انداز میں کہتا ہے کہ "ازہر" مسیحی کلیسا کے لیے خطرہ ثابت ہو تو کیا تدبیر اختیار کی جانی چاہیے۔ اور خود ہی تجویز پیش کرتا ہے کہ ایک مسیحی یونیورسٹی قائم ہونی چاہیے جس کے تمام اخراجات کلیسا برداشت کرے اور یہ یونیورسٹی مسیحیت کے تمام مختلف فرقوں کے کلیساؤں کا مشترکہ ادارہ ہو تاکہ "ازہر" کا آسانی سے مقابلہ کیا جا سکے اور یہ درس گاہ "ازہر" سے بھی بہتر طریقہ پر عربی زبان کی تعلیم دے سکے۔ اور اپنی بات اس فقرے پر ختم کرتا ہے کہ خداوند نے ہمیں مصر کو مرکزِ عمل کے طور پر انتخاب کرنے کی توفیق بخشی ہے بنا بریں ہمیں تمام اسلامی ممالک کو عیسائی بنانے کے لیے اسی مقام پر ایک مسیحی درس گاہ قائم کرنے میں سُرعت سے کام لینا چاہیے۔

اس فقرے پر غور کیجیے کہ "ازہر" کلیسا کے لیے خطرے کا چیلنج ہے اس لیے اسے راستے سے ہٹانا ضروری ہے۔ لیکن کس طرح، ظاہر ہے "ازہر" ایک ہزار بلکہ اس سے بھی زائد سالوں سے مستحکم بنیادوں پر قائم ہے چنانچہ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ تمام ممکنہ وسائل سے کام لے کر اس کی ہزار سالہ انفرادیت کو جو صلیبیوں کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہے ختم کرنے کے لیے یا تو اس طرز کا کوئی اور ادارہ قائم کیا جائے اور یا پھر اس کی منفرد حیثیت باقی نہ رہنے دی جائے تاکہ وہ بھی دوسرے اداروں کی طرح ہو کر رہ جائے۔

اسی باب کے صفحہ ۳۶ پر یہ سطور موجود ہیں:

کانفرنس میں اس کے بعد طبی مشنری وفود کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اور مسٹر "ہارپر" نے کھڑے ہو کر واضح کیا کہ طبی وفود میں مزید اضافہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان وفود کا مسلم عوام سے مسلسل رابطہ رہتا ہے اس لیے دوسرے مشنریوں کے مقابلہ میں ان سے مسلمان زیادہ اثر قبول کرتے ہیں۔

صفحہ ۳۷ پر ہے: مشنری وفد کے ڈاکٹر کو یہ بات کبھی اور کسی حالت میں فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ وہ سب سے پہلے مشنری ہے اور طبیب بعد میں۔

ہمارا مقصد ان اقتباسات کے نقل کرنے سے قارئین کے علم میں یہ بات لانا ہے کہ مشنری کیا کیا ذرائع اور وسائل اختیار کرتے ہیں اور انسانی خدمت کے نام پر کس طرح اللہ کے دین کو تباہ کرنے کا کام سرانجام دیتے ہیں۔

صفحہ ۴۸ پر لکھا ہے: ان مشنریوں کی جدوجہد کا پہلا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں عیسائی بن جائیں اور دوسرا نتیجہ یہ کہ مسلمانوں کے تمام طبقات بتدریج مسیحی افکار قبول کرنے کے عادی ہو جائیں۔

اس سے پہلے صفحہ ۴۷ پر لکھا گیا ہے کہ مشنریوں کو چاہیے کہ مسلمانوں میں اپنے مشنری عمل کے نتائج کمزور دیکھ کر مایوس نہ ہوں کیوں کہ مسلمانوں میں مغربی افکار اور آزادیٔ نسواں کا رجحان بہت زیادہ بڑھ رہا ہے۔

آزادیٔ نسواں کے موضوع پر ہم آگے چل کر تفصیلی گفتگو کریں گے۔ البتہ یہاں ہم اس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ اس زمانہ میں یعنی ۱۹۰۶ میں مشنریوں نے مسلمانوں کو پوری طرح عیسائی بنانے کی بجائے صرف اسی چیز پر اکتفا کر لیا تھا کہ مسلمانوں کے تمام طبقے بتدریج مسیحی افکار اپنا لیں یا دوسرے لفظوں میں ان میں مغربی علوم اور آزادیٔ نسواں کا شدید رجحان پیدا ہو جائے۔

مذکورہ بالا دونوں فقرے پادری "زویمر" کے ہیں جس کے متعلق ہم بتا چکے ہیں کہ مصر اور اس سے قریب اسلامی ملکوں میں یہ خطرناک ترین مشنری تھا۔ اور ان دونوں فقروں میں وہ دراصل یہ بات کہہ رہا ہے کہ مسلمانوں کا رسمی طور پر عیسائی بننا کچھ زیادہ اہم نہیں ہے بلکہ حقیقی اہمیت اس بات کی ہے کہ مسلمان فکری، رُوحانی اور معاشرتی اعتبار سے نصرانی بن جائیں اور یہی وہ مقصد ہے جس میں سامراج پوری طرح کامیاب ہوا ہے۔

قاہرہ کی اس مشنری کانفرنس میں مسلمانانِ ہند کی تحریکِ اصلاح پر بھی بحث ہوئی اور اس تحریک کے علم بردار "سرسید احمد خاں" کا حوالہ بھی دیا گیا اور بتایا گیا کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور اسلامی

تعلیمی کانفرنس کیا خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

قاہرہ کی اس کانفرنس سے پادری "وہائٹ برشٹ" نے بھی خطاب کیا اور "جدید اسلام" کے موضوع پر بات کرتے ہوئے اس نے کہا کہ مغربی تعلیمات مسلمانوں کو عیسائیت سے قریب تر کر دیں گی۔

اس فقرے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں سے جو شخص یا جو مکتبہ فکر اسلام سے منحرف ہوتا ہے سامراجی اسے اُچک لیتے ہیں اور اس کا خوب پروپیگنڈا کر کے اسے اُچھالتے ہیں اور بڑھا چڑھا کر نمایاں کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی کتاب کے صفحہ ۴۶ پر درج ہے کہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کا عمل خود انہی میں سے کسی نقیب کے ذریعہ انجام پانا چاہیے تاکہ وہ خود اپنے ہاتھوں اپنی جڑیں کھوکھلی کریں۔

اس پیراگراف میں "جدید اسلام" کا لفظ بھی قابلِ توجہ ہے۔ کیونکہ یہ ترقی یافتہ اسلام وہی اسلام ہے جس کی مسیحی مشنری تبلیغ کرتے ہیں اور اس کی بنیادیں مستحکم کرتے اور اسے ہوا دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ ان کے خیال میں مسلمانوں کو عیسائیت سے قریب تر کرنے کا ذریعہ ہے۔

صفحہ ۶۰ پر ایک مشنری کا یہ قول درج ہے کہ اسکول مشنری مقاصد کی تکمیل کا بہترین وسیلہ ہیں۔

صفحہ ۸۲ پر ہے: حکومت (جرمن حکومت جس کے قبضہ میں افریقہ کے اسلامی علاقے ہیں) کو چاہیے کہ جب تک مقامی مسلمان باشندے مسیحی مشنری اداروں سے متنفر رہیں ان کی تعلیم کیلیے لادینی مدرسے قائم کرے۔

صفحہ ۷۲ پر ہے: حکومتِ عثمانیہ کے دارالسلطنت میں تمام بڑے ممالک کے سفراء نے اس بات پر اتفاق رائے کیا کہ مغرب کے قائم کردہ ثانوی تعلیم کے مراکز نے "مشرقی مسئلہ" کے حل میں جو کردار ادا کیا ہے وہ نتائج کے لحاظ سے تمام مغربی ممالک کی مشترکہ جدوجہد سے بھی زیادہ ہے۔

یہ اقتباسات بالخصوص آخری اقتباس اتنا واضح ہے کہ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں یہ لوگ خود اعتراف کر رہے ہیں کہ "مشرقی مسئلہ" کے حل میں لادینی مدارس نے جو کردار کیا ہے وہ یورپی حکومتوں کے اس کردار سے زیادہ ہے جو انھوں نے عالم اسلام کو ختم کرنے اور اسے مغربی ممالک کے زیرِ اثر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرنے کے لیے قرار دادیں پاس کر کے ادا کیا ہے۔

"مشرقی مسئلہ" کی اصطلاح یورپ کی تمام تاریخوں میں خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور کے لیے استعمال کی گئی ہے اور اس مسئلہ کا حل اہلِ مغرب کی نظر میں یہ تھا کہ اس خلافت کو ختم کر دیا جائے جو کیسی بھی سہی مگر اسلامی وحدت کا نشان تھی اور اپنی انتہائی کمزوری کے باوجود صرف یہی ایک ایسی قوت تھی جس سے اہلِ یورپ خائف رہتے تھے اہلِ مغرب اس خلافت کو "مردِ بیمار" کہتے تھے مگر یہ مردِ بیمار بھی ان کے لیے پریشانی اور مصیبت کا باعث بنا رہا اور ان کے اعصاب کو بے چین رکھتا رہا حتیٰ کہ انھوں نے بالآخر پہلی جنگِ عظیم میں اپنے خفیہ حلیف "مصطفےٰ کمال پاشا" کی مدد سے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اور اتاترک نے اسلامی وحدت کی علامت کو مٹانے اور اس کی جگہ ترکی میں کمزور لادینی ریاست قائم کرنے کی جو خدمت صلیبی سامراج کے لیے انجام دے کر ان کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچائی تھی اس کے صلہ میں اسے بڑے بڑے عظمت اور ناموری کے خطابوں سے نوازا گیا اور اب تک اس کا ذکر ہمہ جہت خیر سے کیا جاتا ہے۔[1]

ان اقتباسات میں مصنف اعتراف کرتا ہے کہ لادینی مدارس نے مشرقی مسئلہ کے حل

۱؎ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلامی عقیدے کو نقصان پہنچائے بغیر خلافتِ عثمانیہ کے مظالم کو ختم کرنے کا اسلامی طریقہ کیا ہو سکتا تھا مگر اس کے بجائے کمال اتاترک نے جو طریقہ اختیار کیا وہ صلیبی سامراج کی خدمت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس دور کے تاریخی حقائق کو اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی دنیا کی اصلاحِ احوال کے لیے خلافت کو ختم کرنے میں مصطفےٰ کمال کی نیت پر خلوص نہ تھی بلکہ دراصل وہ اپنے ان صلیبی اور صیہونی آقاؤں کے لیے مخلص تھا جنھوں نے اس کے سپرد یہ خدمت کی تھی۔ اور ہم

کرنے یعنی اسلام کو ختم کرنے میں وہ کردار ادا کیا جو جنگ، سیاست اور فوج نہ کر سکے مذہبی وہ مدارس ہیں جن کے لیے ہمارے قلب و نظر فرشِ راہ ہیں اور ہم بڑے فخر سے اپنے بچوں اور بچیوں کو ان میں تعلیم و تربیت کے لیے بھیج رہے ہیں۔

۱۹۱۰ء کی اڈنبرگ کانفرنس کے زیرِ عنوان صفحہ ۲۴ پر تحریر ہے:

"ایڈنبرگ کانفرنس کی کارروائیاں صرف کاغذ پر لکھی نہیں رہ گئیں اس لیے کہ ایڈنبرگ کی مشنری کانفرنس کے بعد جرمنی میں منعقد ہونے والی مشنری سامراجی کانفرنس میں مشنری وفود بھیجنے پر اس قدر زور دیا گیا کہ کانفرنس سیاسی اور سماجی کی بجائے مذہبی اور مشنری بن

مسلسل حاشیہ: قسم کے مکر و فریب سے کام لے کر اسے انجام تک پہنچانے میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ ورنہ کمال اتاترک کو اصلاحِ احوال کے ایسے مواقع حاصل تھے جو اس سے پہلے کسی کو میسر نہ آئے تھے۔ ہر قسم کی طاقت اس کے ہاتھوں میں مرتکز ہو گئی تھی جس کی بنا پر وہ ہر چیز نافذ کر سکتا تھا لیکن اس نے اس تمام قوت کو اسلام کی بیخ کنی پر صرف کیا۔ تعمیری کام نہیں لیا۔ اور اس کے پس پردہ ان صلیبیوں کا عناد کارفرما تھا جو پانچ صدیوں سے اسلامی حکومت سے خوفزدہ رہتے تھے اور ان صیہونیوں کا کینہ کارفرما تھا۔ جن کو سلطان عبدالحمید نے سلطنتِ فلسطین میں قومی وطن دینے سے انکار کر دیا۔ یہی بات "ولفرڈ کانٹ ویل سمتھ" نے بھی اپنی کتاب "اسلام فی تاریخ المعاصر" میں لکھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ صلیبیوں اور صیہونیوں نے خلافتِ عثمانیہ کے مظالم اور برائیوں کو خوب اچھالا اور اتاترک کی عظمت کے مینار کھڑے کیے تاکہ وہ اسلام کی شکست و ریخت کا عظیم کام انجام دے سکے۔ اتاترک کو عظیم ثابت کرنے کے لیے وہ اتحادی قوتیں جو جنگِ عظیم جیت چکی تھیں بڑے ڈرامائی انداز میں کمال اتاترک کے سامنے پسپا ہو گئیں اور پھر صلیبی اور صیہونی اہلِ قلم نے اس کی غیر معمولی عظمتوں کو تسلیم کرانے کے لیے متعدد زبانوں میں سیکڑوں کتابیں تصنیف کیں تاکہ اسے پورے عالمِ اسلام کا مقتدا اور قائد بنا دیا جائے۔ اور اس قسم کی پُر فریب چالوں سے صلیبی اور صیہونی عیاروں نے اس علامت کو ختم کر دیا جس کے گرد پورا عالمِ اسلام مجتمع ہو کر دنیا کی ایک عظیم طاقت بن سکتا تھا اور تاریخ کے ہر دور میں اس کا ایک اپنا مقام تھا اور اس کی جگہ ترکی کی ایک انتہائی کمزور اور بے وزن حکومت قائم کر دی۔ اس کے باوجود "ولفرڈ کانٹ ویل سمتھ" اپنی کتاب میں ترکی حکومت کی قوت، ترقی اور نظام کی تعریفوں کے پل باندھتا ہے اور مسلمانوں کو دعوت دیتا ہے کہ سب مسلمان اسی کے نقشِ قدم پر چل کر طاقت ور بن جائیں۔ (مصنف)

کر رہ گئی ہیں۔

اسی باب کے صفحہ ۸۰ پر درج ہے:

سوئزرلینڈ کے جس مجلہ سے ہم نے سابقہ مقالہ نقل کیا ہے اسی مجلہ میں مشنری وفود بھیجنے کے بارے میں جرمن سامراجی کانفرنس کے موقف پر ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اے کے کنسفیلڈ کا تحریر کردہ ہے۔ جو سامراجی کانفرنس میں اسلامی شعبہ کے سربراہ تھے اور یہ صاحب برلن کی مشنری جماعت کے سیکرٹری بھی ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں لکھا ہے کہ سامراجی کانفرنس دو باتوں کے اعتبار سے ممتاز ہے اول یہ کہ اس میں صنعتی اور اقتصادی مسائل زیر بحث آئے، دوم یہ کہ اس کانفرنس میں اس بات پر اتفاق رائے ہوا کہ جرمنی کی سامراجی سیاست میں اقتصادی اور سیاسی مقاصد کو اخلاقی اور مذہبی اعمال کے ساتھ ضم کر دیا جائے اور اس بات کے لیے ہمبرگ کے چیمبر آف کامرس کے صدر مسٹر شنکال کے اس قول کو سند بنایا گیا ہے کہ "سامراج کی دولت میں اضافہ ان لوگوں کی اہمیت میں اضافہ کرنے پر موقوف ہے جو ان نوآبادیوں میں جاتے ہیں اور اس آرزو کی تکمیل کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نوآبادیات میں مسیحی مذہب پہنچایا جائے۔ اور یہی اقتصادی مقاصد کے حصول کی بھی بنیادی شرط ہے۔" اس کے بعد اس کانفرنس میں مشنریوں اور ارکان کانفرنس میں اسلام کے بارے میں اختلاف رائے ہوا تو صاحب مقالہ مسٹر کنسفیلڈ نے افریقہ میں جرمن نوآبادیوں کے لیے اسلام کے خطرے کی جانب توجہ دلائی اور کانفرنس کے سامنے تجویز رکھی کہ حالاتِ حاضرہ کے نتائج و عواقب کو ہر اعتبار سے یعنی مشنری، فکری اور سیاسی نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ اہمیت دی جائے۔

یہ اقتباس سامراج اور مشن کے درمیان گہرے رابطہ کی نشان دہی کرتا ہے اور اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سامراجیوں کی نظر میں اسلام کو ختم کرنا کتنا ضروری ہے جتنی کہ خالص اقتصادی نقطۂ نگاہ سے بھی ضروری ہے۔ گویا وہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام کا خاتمہ ہی دُنیائے اسلام

کو سامراج کی گرفت میں رکھنے کا واحد ذریعہ ہے اور بعض نادان مسلمان اور ایسے ایجنٹ جو نام کے اعتبار سے مسلمان ہیں اس کام میں ان کی مدد کر رہے ہیں۔

لکھنؤ کانفرنس ۱۹۱۱ء کے زیر عنوان لکھا گیا ہے:

اب مسلمان حکومتوں کے ماتحت رہنے والے مسلمانوں کی تعداد صرف ۳،۷۱،۲۸،۸۰۰ رہ گئی ہے اور مسلمانوں کی اکثریت کا سیاسی اقتدار اسلامی خلافت کے ہاتھ سے نکل کر انگلینڈ، فرانس، روس اور ہالینڈ کی طرف منتقل ہو چکا ہے۔ اس وقت ان یورپی ممالک میں ہر ایک کے زیرِ اقتدار بسنے والے مسلمانوں کی تعداد پوری خلافتِ عثمانیہ میں موجود مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ اور مستقبل قریب میں ہونے والے انقلابات کے بعد عیسائی حکومت کے زیر سایہ رہنے والے مسلمانوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہو جائے گا اور اس صورت میں مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے سلسلے میں عیسائی حکومتوں کی ذمہ داری اور بڑھ جائے گی۔[1]

اور اب آزادئ نسواں کے موضوع کو لیجیے

ہم کتاب مذکورہ بالا کے صفحہ ۴۶ سے یہ اقتباس پہلے نقل کر چکے ہیں:

"مشنریوں کو مسلمانوں میں اپنی مشنری کوششوں کے نتائج کی سست رفتاری دیکھ کر مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ مسلمانوں میں مغربی علوم کے حصول اور آزادیٔ نسواں کا شدید رجحان پیدا ہو گیا ہے۔"

صفحہ ۸۸۔۸۹ پر لکھنؤ اور قاہرہ کانفرنسوں کے فیصلوں میں سے دو فقرے نقل کیے گئے ہیں:

ان تمام حوادث (عالمِ اسلام میں نشأۃ ثانیہ کے قیام کی طرف اشارہ کرنے والے حوادث) کی بنا پر کلیسا کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ پوری کوشش سے کام کرے اور

---

[1] ان انقلابات کی پیشین گوئی ۱۹۱۱ء میں کی گئی تھی۔ اس کے بعد ہی اتاترک کا لایا ہوا انقلاب وقوع پذیر ہوا۔ اور اسی قسم کے اور کئی انقلاب برپا ہوئے۔ یہ سب اسی ملعون صلیبی سامراج کی کارستانی ہے۔ (مصنف)

مشن اور مشنریوں کی کارکردگی پر پوری توجہ دے اسی لیے لکھنو کانفرنس کا پروگرام مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہے:

۱۔ حالاتِ حاضرہ کا مطالعہ۔
۲۔ مشنریوں کی تعلیم اور تعلیمِ نسواں کو وسیع پیمانہ پر پھیلانے کے لیے خصوصی توجہ دینا۔
۳۔ ضروری صلاحیتیں مہیا کرنا۔ اور موجودہ صلاحیتوں کا معیار بڑھانا۔

کانفرنس کے پروگرام کا یہ مواد مجلہ "رئیس" نے شائع کیا ہے۔ اصل پروگرام ممبروں کے سامنے افتتاحی تقاریر، کمیٹی کے انتخاب اور قاہرہ کانفرنس کی رپورٹ سنانے کے بعد پیش کیا گیا جس کا نفسِ مضمون یہ ہے:

۱ سے ۶ تک کی شقیں غیر متعلق ہیں۔ اس کے بعد ملاحظہ ہو۔
۷۔ مسلمان خواتین کا معاشرتی اور نفسیاتی ارتقا۔
۸۔ خواتین کی سرگرمیاں۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ مسلمان خواتین کی آزادی، ان کی تعلیم اور ان کے معاشرتی ارتقا سے اس قدر دلچسپی کیوں؟ اور دلچسپی بھی مشنریوں اور مشن کانفرنسوں کو۔

اور یہ دلچسپی بھی ایسے وقت میں جب دنیائے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خطرہ درپیش ہو اور اس خطرے سے عہدہ برا ہونے کے لیے تجاویز طلب کی گئی ہوں۔ ایسے موقعہ پر آزادیٔ نسواں، ان کی تعلیم اور معاشرتی ارتقاء کی تجاویز پیش کی جائیں۔

آخر ان معاملات سے انھیں دلچسپی کیا ہے اور ان تجاویز کا جو اسلام کو ختم کرنے اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی نشاۃ ثانیہ شروع کرے۔ اس پر آخری اور کاری ضرب لگانے کے بارے میں سوچی جا رہی ہوں۔ ان تجاویز کا آزادیٔ نسواں، ان کی تعلیم اور ان کے معاشرتی ارتقا سے کیا ربط و تعلق ہے۔

کیا یہ مسئلہ قابلِ توجہ نہیں؟ کیا اس میں کوئی راز پنہاں نہیں؟

جی ہاں! واقعہ یہ ہے کہ صلیبی سامراج نے اسلام کی بیخ کنی اور اس کے وجود کو پارہ پارہ کرنے کے لیے جتنی بھی تحریکیں چلائی ہیں آزادیٔ نسواں کی تحریک ان میں خبیث ترین تحریک ہے۔ صرف یہ واحد تحریک مسلم عوام میں اخلاقی، فکری اور دینی بے راہ روی پھیلانے کے لیے کافی ہے اور اس کی تاثیر باقی تمام وسائل کی مجموعی تاثیر سے زیادہ ہے۔

ظاہر ہے جب عورت سرِ راہ بے لباس نظر آئے گی اور للچائی ہوئی نظروں کے لیے سامانِ فتنہ بن کر مردوں کے حیوانی جذبات برانگیختہ کرے گی تو اسلام، دین اور عقیدہ سب کے سب دھرے رہ جائیں گے۔ اور لوگوں میں اخلاقی بندش اور ضبط و قرار کا پاس و لحاظ باقی نہیں رہے گا اور یہی وقت صلیبی سامراج کے لیے اسلام پر آخری اور کاری ضرب لگانے کا بہترین موقعہ فراہم کرے گا۔

قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا مسلمان عورت واقعی جہالت، پسماندگی جمود و انحطاط اور غلامی میں مبتلا نہ تھی اور اس کی ناگفتہ بہ حالت کا تقاضا نہ تھا کہ اس کی آزادی، تعلیم اور اجتماعی اور نفسیاتی ترقی کے لیے کوشش کی جائے؟

بے شک! یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن یہی کام جب صلیبی سامراج انجام دے گا تو قدرتی طور پر اس کا مقصد مسلمان عورت کی حالت کو بہتر بنانا اور اسلامی معاشرے کو درست کرنا نہیں ہوگا۔ ہم مشنریوں کے اقوال پیش کر چکے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں مسلم معاشرہ کو پارہ پارہ کرنے، اس میں اخلاقی زوال پیدا کرنے اور مسلمانوں کی قوت کو ضعف میں بدلنے کے لیے کرتے ہیں۔

چنانچہ جب سامراج آزادیٔ نسواں کے لیے کوشش کرتا ہے تو اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ معاشرے میں نشوو ارتقا پیدا ہو جیسا کہ وہ خود اور اس کے تنخواہ دار ملازم دعوے کرتے ہیں بلکہ اس آزادی سے سامراجیوں کا مقصد خود عورت میں اور معاشرے میں فساد پیدا کرنا ہے۔

سامراج جب مسلمان عورت کو تعلیم دیتا ہے تو اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کی برائی سیکھ لے اور اپنے فساد کو ترقی، نفسیاتی، اجتماعی اور فکری اصولوں پر مضبوطی سے قائم و استوار کر لے۔

اور جب سامراج عورت کے نفسیاتی اور معاشرتی ارتقا کی بات کرتا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عورت فتنہ و فساد اور گمراہی کے گہرے غار میں جا گرے اور اسی میں پڑی رہے پھر اس میں سے نکل نہ سکے۔

چنانچہ سامراج نے جو کچھ چاہا تھا وہ ہو کر رہا اور پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

مسلمان عورت کی آزادی، تعلیم اور اس کا معاشرتی اور نفسیاتی ارتقا اسلام کے مقاصد میں بھی شامل ہے مگر اسلام ان امور کو دینی اور اخلاقی بے راہ روی کی بنیاد پر استوار نہیں کرتا جیسا کہ اسلام کو ختم کرنے کی غرض سے ان امور کے ذریعہ صلیبی سامراج کا ارادہ ہے بلکہ اسلام ان سب چیزوں (آزادی تعلیم اور معاشرتی و نفسیاتی ارتقا) کو انسانی فرد کے لیے ممکن الحصول رفعت و تکریم کی بنیاد پر اور انسانی معاشرے کی پاکیزگی اور نظافت اخلاق کی اساس پر استوار کرتا ہے۔

ہم نے اپنی دیگر تصنیفات میں اسلامی نقطہ نگاہ سے عورت کے مقام اور حیثیت کے موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ہے جس کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے لیکن ضمناً یہ بات یہاں کہنا مناسب ہوگا کہ صلیبی سامراج نے اسلامی دنیا میں عورت اور آزادیٔ نسواں کا مسئلہ کھڑا کر کے ایک عظیم اجتماعی فتنہ برپا کر دیا ہے تاکہ اسلامی معاشرہ اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے جس طرح ڈائنامیٹ سے چٹان پارہ پارہ ہو جاتی ہے

مستشرقین کا فتنہ

ان سب چالوں کے پہلو بہ پہلو وہ "سیکولر" مشنری کوششیں بھی جاری ہیں جو مستشرقین کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین نے اپنا رول بڑے خلوص سے ادا کیا ہے۔ انھوں نے دنیائے اسلام میں اپنے شاگرد دانشوروں کا ایک طبقہ پیدا کر کے اپنی بساط کے مطابق

ایک بہت بڑے فتنے کو جنم دیا ہے اور اس فتنے کو پروان چڑھانے میں پرائمری اور ثانوی سکولوں نے پھر کالجوں اور یونیورسٹیوں نے بتدریج بڑی مدد دی ہے۔

جس طرح مشنری کوششوں کا ہدف عام لوگ تھے (جیسا کہ خود انھوں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے اور جیسا کہ ان مشنریوں کے شہروں اور دیہات کے جاہل عوام میں گھل مل کر انھیں فریب دینے سے ظاہر ہوتا ہے) اسی طرح مستشرقین کی تمام تر جد و جہد کا نشانہ دانشور طبقہ تھا۔ کیونکہ یہی طبقہ مستشرقین کے اسلام کے خلاف اٹھائے ہوئے فکری، فلسفیانہ، قانونی، معاشرتی اور اقتصادی شکوک و شبہات کو سمجھ کر ان سے اثر قبول کر سکتا ہے اور چونکہ یہ دانشور لوگ سکولوں اور کالجوں سے ہی اس زہر کے ابتدائی اثرات اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہوتے ہیں اس لیے ان کے جال میں آسانی سے پھنس جاتے ہیں اور پھر اپنی تصنیفات، اپنے مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں اور اپنی مجلسوں اور گھروں میں یہ زہر آئندہ نسلوں کی طرف منتقل کرتے رہتے ہیں جس کے نتیجہ میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دانشوروں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہو جاتی ہے جو شبہات و اعتراضات کے سوا اسلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔

ہم نے اپنی کتاب "شبہات حول الاسلام" میں اسلام کے بارے میں مستشرقین کے اٹھائے ہوئے اعتراضات و شبہات کے تسلی بخش جوابات دیے ہیں۔ انہی شبہات کو اپنا کر اشتراکیوں نے ان میں معاشی پہلو سے بعض شبہات کا مزید اضافہ کیا ہے جس کی طرف مستشرقین زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے مثلاً "انفرادی ملکیت"، "جاگیرداری" اور "سرمایہ داری" وغیرہ۔ میں نے اپنی اس کتاب میں "عقیدہ"، "وحی" اور "نبوت" وغیرہ کے بارے میں پیدا کردہ لچر اور فضول قسم کے شبہات و اعتراضات پر جن کو مستشرقین بہت ہی ذلیل طریقے پر اور بڑے اصرار سے پیچیدہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بحث اور ان کا رد نہیں کیا ہے اس لیے کہ اس کتاب میں میں اسلام کو معاشرے میں ایک زندہ وجود (ایسا زندہ وجود جو معاشرے کے افراد کے روابط و تعلقات کی تنظیم کرتا ہے) کی حیثیت سے پیش کرنے میں مشغول تھا۔ اس کتاب میں میرے مدنظر

اسلام کا یہ پہلو پیش کرنا نہیں تھا کہ وہ ایک نظریہ اور عقیدہ بھی ہے جو انسان کے ذہن و شعور پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ پوری زندگی اس کے زیر اثر آ جاتی ہے۔ دُوسری بات یہ ہے کہ "عقیدہ"، "وحی" اور "نبوت" کے بارے میں مستشرقین کے اعتراضات اتنے فضول قسم کے ہیں کہ کوئی شخص بھی ان کو بحث کے قابل سمجھ کر ان کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کر سکتا۔

اس سلسلے میں "مارگلیوتھ" کی مثال کافی ہے جو مستشرقین کا امام شمار ہوتا ہے اور ہمارے ہاں بھی اس کے بڑے بڑے شاگرد موجود ہیں جو جاہلی شاعری اور قرآن مجید کے سلسلے میں اس کو اور اس کے خیالات و افکار کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ یہ شخص تاریخ عالم کے انسائیکلوپیڈیا (UNIVERSALHISTORY OF THE WORLD) میں اسلام پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مجہول النسب تھے (العیاذ باللہ) کیونکہ آپ "محمد بن عبداللہ" تھے اور عرب ہر اس شخص کو جس کا نسب معلوم نہ ہو "ابن عبداللہ" کہہ دیتے تھے۔

گوہر افشانی ملاحظہ کیجیے: محمد ابن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم .... ابن قصی یعنی محمد رسول اللہ ایک ایسی سوسائٹی میں (جو جس قدر انساب کے بارے میں جانتی تھی کسی اور چیز کے بارے میں نہیں جانتی تھی اور جتنا نسب کو اہمیت دیتی تھی کسی اور چیز کو نہ دیتی تھی) مجہول النسب ہوتے ہوئے اس سوسائٹی کے خداؤں، ان کی روایات، عبادتوں، عادتوں اور معاشرے کو چیلنج کرتے ہیں اور وہ سوسائٹی آپ کی مجہول النسبی کو چیلنج نہیں کرتی؛ اس سے زیادہ فکر و نظر کا افلاس اور اظہار و بیان کا لچرپن اور کیا ہو سکتا ہے؟

بہرکیف! میں یہاں مستشرقین کی اسلام کے بارے میں فریب آمیز باتوں اور ان کے اعتراضات کا جواب نہیں دے رہا ہوں بلکہ صرف تاریخی واقعات پیش کر رہا ہوں۔

ضمناً میں "لیوپولڈ فائس" (محمد اسد) کی کتاب "الاسلام علی مفترق الطرق" جس کا ترجمہ "عمر فروخ" نے کیا ہے میں سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں جو اس حقیقت پر روشنی ڈالتا

ہے۔ وہ اپنی کتاب کے صفحہ ۵۸ - ۵۹ پر لکھتے ہیں:

"چند دہائیوں کے بعد مغربی علماء اجنبی کلچر کا مُطالعہ کچھ زیادہ دلچسپی سے کرنے لگے۔ لیکن اسلام کے بارے میں روایتی تحقیر کا غیر معقول انداز ان کی علمی بحثوں میں صاف جھلکتا رہا۔ گویا اسلامی دنیا اور یورپ کے درمیان وہ خلیج نہ پاٹی جا سکی جسے تاریخ نے کھودا تھا۔ اسلام کی تحقیر کرنا مغربی فکر کا بنیادی جزو بن چکا ہے۔ دراصل جدید دَور کے مستشرقین وہ عیسائی مشنری ہیں جو اسلامی دنیا میں مصروفِ عمل ہیں۔ ان کی تیار کردہ اسلامی تعلیمات و تاریخ کی بدنما تصویر دراصل اس موقف کی ترجمانی ہے جو عیسائیوں نے بزعم خویش "بُت پرستوں" یعنی مسلمانوں کے مقابلے میں اختیار کر رکھا ہے۔ باوجودیکہ اب مستشرقین کی علمی کاوشیں مشنری اثرات سے آزاد ہو چکی ہیں اور مستشرقین کے علمی کارناموں کے لیے مذہبی تعصب کا وہ عذر باقی نہیں رہا جو ہر چیز کو بگاڑ کر پیش کرنے کا باعث تھا پھر بھی ان کے ہاں عقلی فریب کاری بدستور باقی ہے دراصل مستشرقین کا اسلام پر غصہ نکالنا ایک موروثی خصلت اور طبعی عادت ہے اور یہ ان اثرات کا نتیجہ ہے جو صلیبی جنگوں نے اہل مغرب کے ذہنوں پر مُرتسم کیے ہیں"۔

بے شک مستشرقین نے اسلامی موضوعات کے سلسلے میں عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے منظم طریق کار بطور نصوص کی تنقیح و تحریر میں ان کی بے نظیر محنت و مشقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا (اگرچہ نصوص کے سمجھنے اور واقعات کی تعبیر میں اکثر غلطیاں کر جاتے ہیں) یہ لوگ نہایت محنت اور کوشش کے ساتھ ان قدیم عربی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں جن کی تالیف و ترتیب میں کوئی نظم و ربط نہیں ہے اور جن کا مطالعہ اکثر اہل عرب پر بھی شاق گزرتا ہے جبکہ عربی ان کی اپنی زبان ہے اور وہ اس کے محافظ اور علمبردار ہیں اور باوجودیکہ اہل عرب ان کتابوں کے وارث ہیں۔ ان کی حفاظت، ان کی نشر و اشاعت، ان سے استفادہ اور ان کی تحقیق و تفتیش ان کا فریضہ ہے لیکن وہ پھر بھی ادھر توجہ نہیں دیتے۔

یہ بے مثال خوبیاں اور قدیم آثار کی دریافت اور اشاعت کے لیے جو محنت شاقہ

اُنھوں نے کی ہے (قطع نظر اس بات کے کہ وہ ان کے فہم وتعبیر میں بے شمار غلطیاں ، بلکہ بسا اوقات مضحکہ خیز غلطیاں بھی کر جاتے ہیں) یہ سب خدمات اس قابل ہیں کہ ان کا اعتراف کیا جائے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تمام محنت وکاوش کا مقصد کیا تھا؟ کیا یہ سب کچھ ان لوگوں نے اسلام کی خدمت کے نقطۂ نگاہ سے کیا ہے یا اس کا مقصد اسلام کی صورت مسخ کرنا اور اسے لوگوں کے سامنے مکروہ بنا کر پیش کرنا ہے؟

اس محنتِ شاقہ کے وقت مستشرقین میں ایک عالم کی رُوح جلوہ گر ہوتی ہے یا مستشرق کے لباس میں کوئی مشنری چھپا ہوتا ہے جو اسے آمادۂ عمل کرتا اور فکری غذا مہیا کرتا ہے۔

"مارگلیوتھ" کا عالم کا ضمیر اس وقت کہاں چلا گیا تھا جب وہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب میں شک پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جبکہ جزیرہ نمائے عرب میں انساب کی حفاظت ایک مقدس فریضہ تھا جو معاشرے اور مروّجہ دستور کی طرف سے ان پر عاید ہوتا تھا۔

اور یہی عالم کی روح "گرونیبام" میں اس وقت کہاں تھی جب وہ اپنی کتاب "الاسلام" میں کہتا ہے کہ اسلام کی نظر میں علم وہی ہے جو صرف دین یعنی امورِ آخرت کے کام آئے جب کہ وہ خود اپنی اسی کتاب میں یہ بات بھی ثابت کرتا ہے کہ اسلام ایک ایسا نظامِ زندگی ہے جو بیک وقت دین اور دُنیا دونوں کا احاطہ کرتا ہے اور اس میں دین دُنیا سے اور معاشرہ شریعت سے جُدا نہیں ہوسکتا۔

اور کیا "ولہوزن" میں ایک عالم کا ضمیر موجود تھا جس وقت اس نے اپنی کتاب "الدولۃ العربیۃ" میں یہ لکھا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے مسلمانوں سے خلافت غصب کرلی تھی۔ حالانکہ اگر وہ کہتا کہ انھوں نے حضرت علی سے خلافت غصب کی تھی تو شاید اس کی بات کسی حد تک قابلِ اعتنا بھی ہوتی لیکن وہ تو کہتا ہے کہ مسلمانوں سے غصب کی تھی۔ دُوسری جگہ کہتا ہے کہ جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کمزور تھے تو آپ نے یہود سے صلح کا مُعاہدہ کر

لیا تھا پھر جب طاقت وَر ہوگئے تو مُعاہدے سے پھر گئے اور قومی تعصب کے ماتحت انھیں نکال باہر کیا۔ یہ شخص ان حقائق کا ذکر نہیں کرتا جو تاریخ میں موجود ہیں کہ مسلمانوں سے نقضِ عہد خُود یہود نے کیا تھا اور ہر وہ کام کیا تھا جو دشمن کرتا ہے۔ مشرکینِ مکّہ کو مسلمانوں پر حملہ کے لیے اکسایا، مدینہ کے منافقین کے ساتھ سازباز کی۔ ہر قسم کی گندی افواہیں پھیلائیں اور سب سے بڑھ کر مدینہ میں ہی ایک مسلمان عورت پر قابلِ شرم دست درازی کی۔

یہ عالم کا ضمیر "گولڈزیہر" میں کہاں تھا جب وہ اپنی کتاب "العقیدہ والشریعہ فی الاسلام" میں یہ کہتا ہے کہ اسلام میں کوئی نئی بات نہیں ہے نہ تو اس میں کوئی نیا فکر موجود ہے اور نہ اس کا پیش کردہ انسان سے متعلق مافوق الفطرت اور ماورائی فلسفہ کوئی نئی چیز ہے۔ اس لیے کہ اسلام کا فکری نظام "ہیلینی" فکر وتخیل کی ترقی یافتہ شکل ہے اور اس کا فقہی نظام "رومی" قانون سے ماخوذ ہے اس کا سیاسی نظام "ایران" کے سیاسی نظریات سے متاثر ہے اور اس کے تصوف پر "ہندی" اور "نوافلاطونی" تصوف کی چھاپ ہے۔

اسی طرح "مارگلیوتھ" کے شاگرد "قابین رابن" میں کون سی عالم کی رُوح موجود تھی جب وہ اپنی کتاب "اللغات القدیمۃ فی غربی البلاد" میں کہتا ہے کہ قرآن مجید میں متعدد لغوی اور نحوی غلطیاں موجود ہیں مسلمان صدیوں تک ان اغلاط کی اصلاح کرتے رہے پھر بھی بعض غلطیاں ابھی تک باقی ہیں۔

یہ اور اسی قسم کی بے شمار لغو باتیں ان مستشرقین کی کتابوں میں موجود ہیں جن کو عقل علم اور ضمیر کسی حالت میں قابلِ توجہ خیال نہیں کرتے۔ اس کے باوجود اسلامی دنیا میں ان کو پسند کرنے والے اور ان کے شاگرد کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ ان مستشرقین کا فتنہ اتنا ہمہ گیر ہے کہ بعض ایسے مسلمان بھی جن کی نیت پر شُبہ نہیں کیا جاسکتا ان کی کتابوں سے دھوکہ کھا کر اپنی تصنیفات میں ان کا حوالہ دیتے ہیں اور یہ حوالہ جات بھی صرف تاریخی واقعات یا نصوص کے متن نقل کرنے تک محدود نہیں ہیں بلکہ اسلامی نظریات سے

بحث کرتے وقت اور تاریخی واقعات کی تعبیر و تفسیر میں حتیٰ کہ قرونِ اولیٰ کی برگزیدہ شخصیات کے سلسلہ میں بھی ان کے افکار و خیالات کو اپنی تحریروں کا ماخذ بنا لیتے ہیں۔ اور انھیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ ان مستشرقین کا مطمحِ نظر علانیہ یا پوشیدہ طور پر صرف ایک ہے اور وہ ہے اسلامی عقیدہ میں مغالطہ پیدا کرنا، اسلام کے اصل تصور پر پردہ ڈالنا، مسلمانوں کی قابلِ احترام شخصیات کے بارے میں شکوک پیدا کرنا اور دین کو قائم کرنے والے بزرگ حضرات کی نیتوں کے سلسلہ میں شبہات پیدا کرنا۔

جب ان مستشرقین کے فتنہ سے متاثر ہونے میں ان مسلمانوں کا جو ضمیر و دانش کے لحاظ سے پکے مسلمان ہیں یہ عالم ہے تو ان پست ذہن دانشوروں کا کیا حال ہوگا جو اسلام کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا یہ مستشرق انھیں بتاتے ہیں اور اس ٹولے کا کیا حال ہوگا جو اسلام سے بیزار ہے اور مذہب کے بارے میں ہر اعتراض اور طعن و تشنیع کو تو بڑی خوش دلی سے قبول کر لیتا ہے اور ایسی بات سننے سے بدک جاتا ہے جس میں حقائق بیان کیے گئے ہوں اور جو فکر کو صحیح سمت عطا کرے جن کو مسلمان خوب پہچانتے ہیں اور جن کے بارے میں قرآن مجید میں کہا گیا ہے:

وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ دُونِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝٤٥ الزمر "جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل کڑھنے لگتے ہیں اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوشی سے کھِل اٹھتے ہیں۔" حقیقت یہ ہے کہ مستشرقین کی یہ کاوشیں اسلام کے خلاف منظم سازش کا ایک حصہ ہیں۔

اور یہ ایک بہت ہی خبیث جدوجہد ہے۔

دراصل ...... ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ اسلام پر براہِ راست حملہ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ اس طرح مسلمانوں کا شعور و احساس بیدار ہو جائے گا اور وہ ہماری چالوں سے

باخبر ہو کر اپنے دین کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو جائیں گے۔

اس لیے انھوں نے انتہائی پُرفریب طریقِ کار اختیار کیا وہ شہد میں زہر ملا کر دیتے ہیں۔ پہلے اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتیں بیان کرتے ہیں اور اسلام کی عظیم ترین خصوصیات اور اعلیٰ ترین خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ جب مسلمان قاری مطمئن ہو جاتا ہے کہ یہ مستشرق اسلام دوست ہے اور اس کے دل میں کوئی بُرائی نہیں ہے تو اس غفلت کی حالت میں اس کو زہر کا ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ اسلام کی عظمتوں کے تذکرے کے دوران ہی عقائد اسلام کے بارے میں شکوک پیدا کیے جاتے ہیں اور نفس کی گہرائیوں میں اور ذہن کی سطح پر شبہات کی تخم ریزی کی جاتی ہے۔

یہی اعلیٰ درجہ کی فریب کاری اور عیاری ہے مسلمان جب دیکھتا ہے کہ ایک مسیحی مصنف جو اسلام پر ایمان نہیں رکھتا اسلام کی اس قدر مدح و ثنا کر رہا ہے تو اسے اس کی کسی بات میں شک نہیں رہتا اور یقین ہو جاتا ہے کہ ضرور یہ قابلِ اعتراض امور موجود ہیں جو ہماری نگاہوں سے اس لیے اوجھل رہے کہ ہم اندھے موروثی اعتقاد میں مبتلا تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے اس صاف باطن عالم کو توفیق دی ہے کہ غلط امور کو واضح کرے اور صحیح حقائق خالص علمی انداز میں پیش کرے۔

اب اگر آپ کسی ایسے غفلت کے ماتے کو اس نادانی سے جھنجھوڑنا چاہیں اور اسے کہیں کہ ایک غیر مسلم سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں حق گوئی سے کام لے گا اور تم کس طرح ایک ایسے شخص کو جو اس دین پر ایمان نہیں رکھتا دینی امور سیکھنے اور سمجھنے کے لیے ماخذ بنا سکتے ہو تو یہ شخص اپنی اسی نادانی کے زیرِ اثر کہے گا کہ یہ درست ہے کہ یہ مستشرق اسلام پر ایمان نہیں رکھتا لیکن جو علمی بحث اور گفتگو وہ کرتا ہے اسے دینی تعصب سے کوئی واسطہ نہیں۔

یہ ایک اچھی بات ہے کہ ہم مستشرقین کا محنت طلب اور صبر آزما طریقۂ تحقیق اختیار

کریں اور ان کی طرح کتابوں کے متن اور حواشی کا گہرا مطالعہ کریں۔ اگر ہم اس انداز میں محنت کریں تو نصوص کو سمجھنے میں اور واقعات کی صحیح تعبیر و تفسیر کرنے میں نیز محترم شخصیات کو ان کا حقیقی اور مناسب مقام و مرتبہ دینے میں ان سے بہتر کام کر سکتے ہیں یہ سب کچھ ہمیں ان سے سیکھنا چاہیے لیکن اگر ہم دین کی حقیقت سمجھنے میں مستشرقین کو اپنا رہبر مان لیں تو یہی وہ صلیبی فتنہ و فساد ہے جو مسلمانوں کو اپنی گرفت میں لے کر ان کو تباہ و برباد کر رہا ہے۔

مستشرقین کی جتنی کتابوں کا میں نے مطالعہ کیا ہے میرے خیال میں ان میں خبیث ترین کتاب "الاسلام فی تاریخ المعاصر" ہے جس کا میں نے اپنی اس کتاب میں کئی مقامات پر حوالہ بھی دیا ہے اس میں بھی تحسین و تعریف کا انداز اختیار کیا گیا ہے یعنی اسلام کی تعریف و توصیف کرتے کرتے ضمناً اپنے زہریلے خیالات درمیان میں شامل کر دیتا ہے۔

مگر اس کتاب میں خباثت کی ایک نئی تکنیک بھی اختیار کی گئی ہے اور وہ یہ کہ مصنف ایسے حقائق کا اعتراف کرتا چلا جاتا ہے جن کے متعلق آپ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی مغربی عیسائی کسی حالت میں ان کا اقرار کر سکتا ہے۔ اور یہ شخص ایسا اس لیے کرتا ہے "تاکہ خالص علمی فضا اور مکمل علمی دیانت داری کا تاثر قائم ہو جائے اور کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے

چنانچہ وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ مغرب صلیبی جنگوں کو نہیں بھلا سکتا اور نہ اس کے دل سے یہ بات نکل سکتی ہے کہ اسلام کئی صدیوں تک یورپ کے گھر کے اندر بیٹھ کر اس کے لیے خطرہ بنا رہا ہے۔

مصنف اسی کتاب کے صفحہ ۱۱۱ پر اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ مغرب مسیحیت اور اسلام کی قدیم دشمنی کی بنا پر عرب مسلمانوں کے مقابلے میں صہیونیت کا ساتھ دیتا رہا ہے۔

صفحہ ۱۰۴ - ۱۱۲ پر اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ یورپ نے اسلامی دنیا کو ذلیل و حقیر کرنے اور احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کے لیے اپنے تمام جنگی، علمی، فکری، اجتماعی اور اقتصادی

وسائل اور قوتیں اسلامی دنیا کے محاذ پر لگا دی ہیں۔

بلکہ جب مصنف اسلام اور مسیحیت کی قربانیوں کا موازنہ کرتا ہے تو اپنی اسی کتاب کے پہلے باب میں یہ اعتراف کرتا ہے کہ مسیحی عقیدے کے تاریخی واقعات منفی فکر کے حامل ہیں جبکہ اسلامی حوادث و واقعات حتیٰ کہ اسلام کی قربانیاں بھی مثبت نتائج رکھتی ہیں۔

مسیحی اپنی جان کی بازی اس لیے لگاتا ہے کہ تاریخ کی اس مخالف روش کو روک سکے جو آگے چل کر اسے کچل ڈالے گی اور اس کے قربانی دینے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس نے کم از کم اپنی زندگی میں تاریخ کی منحرف روش کو روک دیا۔ وہ اس کی سمت بدلنے اور رفتار کو درست کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ جبکہ مسلمان اگر قربانی دیتا ہے تو تاریخ کا رُخ بدل کر رکھ دیتا ہے۔

غور کیجیے ایک مغربی عیسائی سے آپ اس سے زیادہ نیکی اور پاک باطنی کی کیا توقع رکھ سکتے ہیں؟

کیا ان اعترافات کے بعد بھی آپ اس کی کسی بات پر شک کریں گے؟ اور کیا اس کے بعد آپ کو اس کے خلوص اور نیک نیتی میں شبہ ہو سکتا ہے جب وہ اسی کتاب کے چوتھے باب میں یہ کہتا ہے کہ ترکی ریاست لادینی (SECULAR) بنیادوں پر قائم ہونے کے باوجود خدا کے بزرگ کی قسم مسلمان ہی ہے اور اس نے اسلام سے ہرگز انحراف نہیں کیا بلکہ صرف اسلام کی نئی تعبیر اختیار کر کے دین و حکومت، دین و معاشرہ، دین و روایات، دین و اقتصادیات، دین و قانون اور دین اور عملی زندگی کو علیحدہ علیحدہ کیا ہے"۔

اور آپ اس کے حسنِ نیت کے اس وقت بھی معترف رہیں گے جب وہ کہتا ہے کہ "دراصل ترکی ہی وہ بہترین مثال ہے جس کی تقلید تمام دُنیا کے مسلمانوں کو کرنی چاہیے تاکہ وہ بھی ترکی کی مانند قوۃ، علم، تہذیب، ترقی اور رفعتِ شان حاصل کر سکیں"۔ جبکہ صورتِ حال یہ ہے جیسے سب لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ خود جدید ترکی ضُعف، فقر، ذلت اور انتشار کی

منہ بولتی المناک تصویر بنا ہُوا ہے۔

اور آپ اس وقت بھی اس کی نیک نیتی میں شک نہیں کریں گے جب وہ کتاب کے پانچویں باب میں کہتا ہے کہ "پاکستان قائم نہیں رہ سکے گا کیوں کہ اس نے اپنا نظام دینی بنیادوں پر استوار کیا ہے اور یہ ایک بدترین مثال ہے مسلمانوں کو اس کی تقلید سے پرہیز کرنا چاہیے۔" جبکہ وہ خود ہی اپنی اس بات کو ایک دُوسرے مقام پر بھول جاتا ہے اور کتاب کے اسی باب میں صفحہ ۲۲۵ پر لکھتا ہے: "پاکستان کی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے وقت سے جس پارٹی نے قیادت سنبھالی تھی وہ اسلامی رُوح کی حامل نہ تھی اور نہ اسے اسلام کی حقیقی معرفت حاصل تھی۔ دراصل یہ وہ پارٹی تھی جسے ہندوستان میں برطانوی سامراج نے تیار کیا تھا اور تربیت دے کر اپنے مزاج سے قریب تر بنایا تھا۔"

پھر آپ اس کی نیک نیتی کے اس وقت بھی قائل رہیں گے جب وہ کتاب کے آخر میں ایک طویل پیچیدہ اور بکھرا دینے والی لچھے دار گفتگو کے بعد کہتا ہے کہ دورِ جدید میں زندہ رہنے کے لیے مسلمانوں کو اپنے بنیادی فکر و عقیدے سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ یعنی اس عقیدے سے کہ اسلام صرف مسلم معاشرے میں ہی قائم رہ سکتا ہے اور اس کی جگہ انھیں یہ بنیاد اختیار کرنی پڑے گی کہ مسلمان غیر اسلامی معاشرے میں رہتے ہُوئے بس اپنے عقیدے کی حد تک مسلمان رہیں۔" دراصل مستشرقین اور مشنریوں کی تمام تر کوششوں اور کارروائیوں کا مقصدِ اعلیٰ بھی یہی ہے اور سامراج کی سب سے بڑی خواہش اور غرض بھی یہی ہے (کہ مسلمان بس عقیدے کی حد تک مُسلمان رہے اور باقی سب امور میں ان کی تقلید کرے)۔

کیا اب بھی آپ کو اس مصنّف کے خلوصِ نیت میں کوئی شبہ ہے؟ دراصل یہ دورِ جدید کی ایک صلیبی جنگ ہے جو اسلام کے مقابلہ میں لڑی جا رہی ہے۔ یہی مصنّف

"ولفرڈ کانٹ ویل اسمتھ" اپنی اسی کتاب "الاسلام فی تاریخ العاصر" میں اسلام اور مسیحیت کے درمیان دشمنی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے صفحہ ۱۱۱ پر لکھتا ہے: "ہم کشمکش کی اس طویل تاریخ کو یہاں اس لیے ہرگز نہیں دُہرا رہے ہیں کہ دوبارہ اشتعال پیدا ہو یا اختلافات اُبھریں۔ بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ہم لوگ جو دونوں بلاکوں میں مفاہمت اور مصالحت کے لیے کوشاں ہیں ہمیں جلد کامیابی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔"

ہم بھی اسی مصنّف کی بات کے ابتدائی الفاظ دہراتے ہیں کہ ہم بھی ان سامراجی کارناموں کو یہاں اس غرض سے بیان نہیں کر رہے ہیں کہ دلوں میں صلیبیوں سے نفرت اور کینہ پیدا ہو بلکہ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام پر کہاں کہاں سے اور کس کس طرح حملہ کیا گیا ہے اور اس کے لیے کیا کیا وسائل و ذرائع اختیار کیے گئے اور اس کشمکش کے نتیجہ میں مغرب کو کیا فوائد و نتائج حاصل ہُوئے۔

دراصل ہماری موجودہ مسلمان نسلیں (جو صرف اسلام کا نام جانتی ہیں اور جنہیں صرف یہ معلوم ہے کہ اسلام چند عبادتوں کے مجموعہ کا نام ہے اگر انسان یہ عبادتیں ادا کر لے تو گویا وہ اسلام کی طرف سے عائد کردہ تمام ذمّہ داریوں سے عُہدہ برآ ہو گیا) اسی صلیبی جنگ کے نتیجہ میں پیدا اور تیار ہُوئی ہیں۔

یا پھر اس کے نتیجہ میں وہ نسل پیدا ہوئی ہے جو اسلام کے بارے میں محض شکوک و شبہات میں مُبتلا ہے — اور — کچھ نہیں جانتی۔

اسی صلیبی جنگ کا نتیجہ ہے کہ آج ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ اگر میں نماز پڑھتا اور روزے رکھتا ہوں تو میرے اسلام میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں اپنے لیے افکار، روایات اور اقتصادی و معاشرتی نظام دنیا کے کسی بھی غیر اسلامی فکر، یا غیر اسلامی نظام سے مستعار لے لوں۔

اور اسی صلیبی جنگ کا حاصل وہ مسلمان عورت ہے جو یہ خیال کرتی ہے کہ اگر

میری نیت ٹھیک ہے تو پھر جو لباس چاہوں پہن سکتی ہوں، نوجوانوں سے میل جول رکھ سکتی ہوں اور جس قسم کے تعلقات چاہوں استوار کر سکتی ہوں۔ ان باتوں سے میرے مسلمان ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

ان سب چیزوں سے بڑھ کر اسی صلیبی جنگ کا نتیجہ وہ مسلمان مرد و عورت ہیں جو علانیہ دین سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور مذہب کو جمود، رجعت پسندی اور پسماندگی کی علامت خیال کرتے ہیں۔

تاہم صرف صلیبی جنگ ہی اسلامی عقائد کو پارہ پارہ کرنے کا واحد سبب اور مسلمانوں کو ہر ممکن طریقے سے اسلام سے بیزار کرنے کا واحد عامل نہیں ہے۔ بلکہ اس کے دوش بدوش دوسرے عوامل بھی موجود ہیں جو اسلام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے میں مصروف ہیں اور یہ عوامل صرف اسلامی دنیا تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایک عالمگیر لہر کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

فساد کی عالمگیر لہریں

فساد کی یہ عالمگیر لہریں پھیل کر جب اسلام پر اثر انداز ہونا شروع ہوئیں اس سے پہلے ہی اسلامی دُنیا ان کی آماجگاہ بن کر ان موثرات کے آگے سرنگوں ہو چکی تھی اور اس میں مدافعت اور مقابلہ کی قوت باقی نہیں رہی تھی۔ دراصل یہ موثرات صرف اسلام کے خلاف سرگرم عمل نہ تھے بلکہ ہر مذہبی عقیدے کے حریف بن کر اس کے خلاف مصروف عمل تھے۔ لیکن یورپ میں یہ موثرات وہاں کے مقامی حالات کے منطقی اور طبعی نتیجہ کے طور پر ابھرے تھے اور اچانک نہیں پیدا ہوئے تھے بلکہ تدریجاً آئے تھے جبکہ اسلامی دنیا میں یہ اثرات اجنبی تھے۔ عالمِ اسلام میں یہ نہ تو مقامی حالات و ظروف کا اقتضا تھے اور نہ ان کا عالمِ اسلام کے ماحول سے کوئی ربط و تعلق تھا بلکہ غیر منطقی اور غیر طبعی انداز میں اسلامی دنیا پر مسلط کر دیے گئے تھے۔

اگر دُنیائے اسلام ماضی کی طرح آزاد، طاقت ور اور مضبوط اصولوں پر قائم ہوتی تو یہ بات مشکوک ہے کہ یہ موثرات اس کی بنیادیں ہلا سکتے ہیں اور اسلام کے مفاہیم میں کوئی اساسی تغیر پیدا کر سکتے اگرچہ کچھ جُزوی اثرات ضرور مُرتسم ہوتے مگر اس حالت میں جبکہ اسلامی دُنیا سامراج کے جال میں جکڑی ہوئی تھی اور اسے کمزور و نحیف کرنے کے جو عوامل کارفرما تھے اور جو زہر اسے پلایا جا رہا تھا اس کے زیرِ اثر اس کے قوی کمزور و مضمحل ہو چکے تھے۔ تو اسلامی دنیا کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ اس عالمگیر طوفان کے آگے ایک کمزور اور عاجز کی طرح سرنگوں ہو جائے اور مدافعت و مقاومت کی ادنیٰ سی کوشش بھی نہ کرے۔

یہ طوفانی لہر جسے یورپ ترقی کا نام دیتا ہے اتنی ناگزیر نہ تھی جتنا وہ اسے ناگزیر سمجھتے ہیں لیکن یورپ میں یہ اس لیے "جبر" بن گئی کہ وہاں یہ مقامی حالات و ظروف کا طبعی اور منطقی نتیجہ تھی۔ اس کے باوجود یورپ میں بھی اور وہاں کے حالات و کوائف میں بھی یہ کوئی ایسا بڑا جبر نہ تھی۔ اگر یورپ چاہتا تو کسی دُوسرے آئیڈیل اور دُوسری اقدار پر ایمان لا کر ان مؤثرات کا راستہ اور پھیلاؤ روک سکتا تھا۔

مگر چونکہ یورپ نے ایسا کرنا چاہا ہی نہیں اس لیے "جبر" دراصل یہ نہ چاہنا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد ۱۱)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے اوصاف کو خود نہیں بدل دیتی۔"

بہر حال یہ ترقی اس شکل میں پُوری دُنیا کے لیے بالعموم اور اسلام کے لیے خاص طور پر کوئی جبر نہیں ہے۔

تاریخ میں یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے جب اسلام کو پوری دُنیا سے اعتقادات و عادات کے معاملہ میں مقابلہ درپیش ہو اور اسلام ساری دنیا کے اعتقادات و عادات کو نظر انداز کر کے اپنے مخصوص مفاہیم اور اپنے اقدار و اصول پر قائم رہا اور بالآخر پُوری دُنیا پر اسی کے مفاہیم اور اسی کے اقدار و اصول اثر انداز ہو کر انسانیت کو منحرف راہ سے موڑ کر صراطِ مستقیم کی طرف لے آئے۔

جس زمانہ میں اسلام آیا پُوری دنیا اپنے بادشاہوں، سر برآوردہ لوگوں اور حاکموں کو مقدس مانتی تھی اور اللہ کو چھوڑ کر ان کی پرستش میں مشغول تھی، تو کیا یہ سیاسی نظریہ کہ ساری دنیا غیر اللہ کی پرستش کرتی ہے اسلام کے لیے جبر؟ یا اسلام نے آکر حکّام کو یہ کہنا سکھایا کہ "جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں تم بھی میری بات سنو اور میری اطاعت کرو لیکن اگر میں اللہ اور اس کے رسُول کی نافرمانی کروں تو

تم بھی اطاعت نہ کرو۔" اور یہ کہنا سکھایا: "اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرو۔ اور اگر مَیں بُرا کام کروں تو میری اصلاح کرو۔" گویا انھوں نے اللہ کی ہدایت پر چلنے والی اُمّت مُسلمہ کو اپنے اعمال کا نگران بنا دیا تھا اور حکّام نے خود اُمّت سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کے اعمال کا محاسبہ کرتی رہے۔

جب اسلام آیا تو پُوری دنیا میں اخلاقی فساد برپا تھا۔ تو کیا اخلاق کا مُروّجہ مفہوم جو غالباً اس زمانہ کا "ترقی یافتہ" مفہوم تھا اسلامی معاشرے کے لیے بھی ایسی جبری قوت کی شکل اختیار کر گیا کہ اس معاشرے کے اخلاق بھی بگاڑ کر دوبارہ اسی حیوانیت کی سطح پر واپس لے آتے جس سے اُونچا اُٹھ کر یہ اسلامی معاشرہ ہر قسم کی کمزوریوں کے باوجود اس وقت تک تاریخ کا پاکیزہ ترین معاشرہ رہا جب تک سامراجی اور مشنری (دو صدیوں سے) اس کو تباہ کرنے اور اخلاق بگاڑنے کی جدّوجہد کے لیے نہ پہنچ گئے۔

جس وقت اسلام آیا تھا دُنیا میں "جنگل کا قانون" نافذ العمل تھا۔ طاقت ور کمزور کو کھا جاتا تھا۔ تو کیا انسانیت کا یہ زوال یافتہ مفہوم (جسے یورپ نے اپنی نشاۃ ثانیہ کے بعد "رفعت" کے نام سے اپنا لیا ہے) اسلام کے لیے ایسا جبر ثابت ہُوا کہ وُہ اس کے آگے جُھک جائے یا اسلام نے آکر معاشرے میں طاقت وَر اور کمزور لوگوں کے درمیان تعاون کا اصول مقرر کیا اور ایک ہزار برس تک یہ اصول نافذ العمل رہا۔

تغیّرِ حالات اور ترقی اس وقت تک جبر نہیں بنتے جب تک انسان اپنے وجود کے مثبت کردار کو چھوڑ کر خود کو حالات کے سپُرد نہیں کر دیتا۔ ایسی صُورت میں اس کو حوادث و حالات طبعاً اس مقام تک گھسیٹ لے جاتے ہیں جہاں جا کر طُوفان کا زور تھمتا ہے۔ یا جب تک انسان میں مقاومت اور مُدافعت کی قوت پیدا نہیں ہو جاتی اور یہ تغیرات اس وقت بھی جبر ثابت ہوتے ہیں جب انسان ان کے مقابلے میں خود کو کمزور محسوس کرتا ہے جیسا کہ صلیبی سامراج کے مقابلے میں ہر جگہ اسلامی دنیا کی

حالت ہو گئی تھی۔

بے شک صلیبی سامراج نے ہی غلام اسلامی دنیا کے ذہن میں یہ بات ڈالی ہے کہ تغیر وارتقا جہاں ایک مجبوری ہے وہاں اس میں خیر وفلاح بھی ہے تاکہ اگر ایمان وعقیدے کا کوئی شمہ باقی رہ گیا ہے وہ بھی ہلاکت وفساد کی اس طوفانی موج کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر اس خبیث خیال کو ان کے ذہنوں میں مزید راسخ کرنے کے لیے اس وہم میں مبتلا کر دیا کہ اس مفید عالمی تغیر کا مقابلہ کرنا رجعت، جمود، پسماندگی اور انحطاط ہے اور کسی انسان کو ان ناپسندیدہ اوصاف سے متصف نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے اثرات سے بچنا اور دور بھاگنا چاہیے۔ ظاہر ہے اس ذہنی فضا کے پیدا ہو جانے کے بعد کون شخص اس گڑھے میں گر کر خود پر رجعیت اور جمود وانحطاط کی تہمت لگوانا پسند کرے گا۔ اس صورت میں اسے بچاؤ کا راستہ یہی نظر آئے گا کہ اس طوفان کے ساتھ بہتا رہے اور "ترقی یافتہ"، "بلند خیال" کے اچھے خطابوں سے نوازا جائے اور رجعیت اور جمود کی تہمت سے بچا رہے۔

اس بات سے مجھے چند سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا جو دریا کے ساحل پر پیش آیا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی (جو اگرچہ سکرٹ پہن کر دریا پر آئی تھی پھر بھی اس میں فطری نسوانی حیا کا کچھ شمہ ابھی باقی تھا) ریت پر بیٹھ کر فوٹو گرافر سے تصویر بنوانے لگی لیکن اپنی بچی کھچی حیا کے زیر اثر ٹانگیں جوڑ کر بیٹھی۔ فوٹو گرافر چونکہ ایک ترقی یافتہ پوز لینا چاہتا تھا اس لیے اس نے اٹھ کر اس کی ٹانگوں کے درمیان فاصلہ کرنا چاہا مگر وہ اپنی اسی بچی کھچی حیا کی وجہ سے انکار کرتی رہی۔ یہ صورت حال دیکھ کر فوٹو گرافر نے بہت معنی خیز لہجے میں کہا "اوہ خدایا میں سمجھا! تم دیہاتی ہو! ورنہ یہ انکار؟" یہ فقرہ سنتے ہی لڑکی کے دل، چہرے اور جسم میں حیا کا جو شمہ باقی رہ گیا تھا وہ بھی کافور ہو گیا اور بڑی بے تکلفی سے ٹانگیں چوڑی کر کے ایک خوبصورت "ترقی یافتہ" پوز بنوانے کے لیے خود کو پیش کر دیا۔

کمزور ومجبور مسلمانوں کے ساتھ بھی صلیبی سامراج کا یہی طرز خطاب ہوتا ہے۔ ارے کیا تم دقیانوسی ہو! ورنہ کیا بات ہے؛ یہ سنتے ہی ان کی قوت مدافعت جواب دے جاتی ہے اور خود سپردگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ ہے وہ جبریت جس کے ذریعے اسلامی ملکوں میں جن کی عقل، قوت ارادی اور غور وفکر کی صلاحیت سلب ہو چکی تھی مغربی تہذیب کے لیے راہ ہموار کر کے اس تہذیب کو مسلط کیا گیا ہے۔

یقیناً! صنعتی ترقی اپنے بہت سے پہلوؤں کے اعتبار سے خیر تھی لیکن کیا صلیبی سامراج نے صنعت کو دنیائے اسلام میں داخل ہونے اور پنپنے دیا یا پوری قوت اور قطعیت کے ساتھ اسے اسلامی دنیا میں آنے سے روک کر اور اس دنیا کو صنعتی اور اقتصادی پس ماندگی کی حالت میں رکھ کر اپنے مخصوص اغراض ومقاصد حاصل کیے؟

البتہ! ترقی کے نام پر اخلاقی اور دینی فساد برپا ضرور کیا کیونکہ اس کے ذریعہ امت مسلمہ کی اخلاقی تباہی اور ان کی قوت کو منتشر کرنے کا مقصد پورا ہونا تھا اور عالمی ترقی کے پھیلاؤ کو جبر قرار دینے کے باوجود اسلامی دنیا میں صنعتی ترقی کے ہر وسیلہ اور طاقت اور کامیابی کے ہر ذریعہ کو پہنچنے سے روکے رکھا۔

یہ صرف ایک مثال ہے اور اس لیے پیش کی گئی ہے کہ شاید اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے ذہن میں رینگنے والے بہت سے فضول خیالات کی وضاحت ہو جائے اور وہ سامراج کی گمراہ کن اصطلاحات "جبر" اور "ترقی" وغیرہ کو سمجھنے لگیں۔

اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ عالمی طوفانی لہریں کون سی ہیں جن کے لیے سامراج نے اسلامی دنیا کے دروازے کھول دیے ہیں اور اس سے مقابلے اور مدافعت کے تمام وسائل مسدود کر دیے ہیں اور مقاومت کی ہر کوشش کو رجعت پسندی، جمود وپسماندگی اور انحطاط کا نام دے کر اس سے بیزار دیا ہے۔

دو صدیوں پر پھیلی ہوئی ترقی کی داستان کو چند سطروں میں بیان کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میں نے اپنی کتاب "معرکۂ التقالید" کے باب "جولۃ مع التاریخ" میں بتایا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدا میں خود یورپ کے اندر رفتارِ حالات کیا تھی۔ اقوامِ یورپ کن حالات کے زیرِ اثر دین داری اور اپنی مذہبی روایات (خواہ یہ دین کیسا بھی تھا اور دینداری کا مقام اور مذہبی روایات میں سنجیدگی کا عالم کچھ بھی تھا) کو چھوڑ کر ایسی اقوام بن گئیں جن کا نہ کوئی مذہب ہے نہ روایات و اخلاق اور جو اب خالص مُلحدانہ فضا میں ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہر طرح کی حیوانی لذت میں ڈوبی ہوئی زندگی گزار رہی ہیں۔

میں نے اس کتاب میں لکھا ہے۔ اس ترقئ معکوس میں "ڈارون" کا نمایاں حصّہ ہے۔ ڈارون ۱۸۰۹ء میں پیدا ہُوا، ۱۸۵۹ء میں اس نے اپنی کتاب "اصل الانواع" شائع کی اور ۱۸۷۱ء میں "اصل الانسان" کی اشاعت ہُوئی۔

ان دونوں کتابوں کے شائع ہوتے ہی لوگوں کے عقاید بُری طرح متزلزل ہو گئے۔ کیونکہ دین نے یہ تصور دیا تھا کہ انسان تمام مخلوقات میں ایک ایسا ممتاز وجود ہے جو سب حیوانات سے یکسر مختلف اور جُداگانہ رُوح کا حامل ہے۔ اسی ایک حقیقت کی بنیاد پر وہ تمام رُوحانی، معنوی، دینی اور فکری اقدار قائم تھیں جن کا حیوان میں کوئی وجود نہیں ہے۔

اور اس چیز سے قطع نظر کہ یورپ کے لوگ ان اقدار کے کس قدر حامل تھے اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ بہرحال یہ اقدار موجود تھیں۔ خواہ ان کا وجود باطنی حس میں تھا جو انسان کے اندر پوشیدہ حیوان کو پوری طرح آزاد ہونے اور مطلق حیوانیت اختیار کرنے سے باز رکھتا تھا۔

لیکن حضرتِ ڈارون نے آکر اعلان کر دیا کہ انسان کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ

وہ ایک ترقی یافتہ حیوان ہے گویا انسان خالص حیوان ہے نہ تو اللہ نے اس میں اپنی رُوح پھونکی ہے اور نہ اس کی تخلیق میں کوئی بلند تر قوت کی کارفرما ہے۔ انسان حیوان ہی کی ایک انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے اس کو حیوان پر صرف اسی قدر برتری حاصل ہے جو اس نے لاکھوں سالوں کے دوران اپنے تدریجی ارتقا کے ذریعہ حاصل کی ہے۔

انسان کی حیثیت کے بارے میں ڈارون اور کلیسا کے درمیان شدید معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ کلیسا نے اسے ملحد و کافر قرار دیا اور ڈارون نے کلیسا پر جہالت اور لغو گوئی کا الزام عاید کیا۔

ابتدا میں عوام نے کلیسا کی حمایت کی کیونکہ ڈارون نے انسان کی تحقیر کر کے اس کی جو بدنما تصویر پیش کی تھی وہ ان پر گراں گزری تھی۔ ڈارون نے انسان کو آسمانی رُوح سے خالی قرار دے کر اور کائنات میں اس کے مقامِ بلند سے گرا کر اسے صرف ایک مادی حیوان قرار دے دیا تھا۔

مگر پھر جلد ہی عوام میں ردِ عمل پیدا ہوا وہ کلیسا کے مخالف اور ڈارون کے ہمنوا بن گئے۔

دراصل ہُوا یہ کہ کلیسا جو عیسائیت کے مزاج کے اعتبار سے رحمت اور رُوحانیت کا مظہر ہونا چاہیے تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں ایک جابر اور دُوسروں کو ذلیل کرنے والے دنیاوی اقتدار کی صُورت اختیار کر چکا تھا جو لوگوں پر مختلف قسم کے تاوان عاید کرتا رہتا تھا۔ کلیسا نے عوام کی دولت پر ٹیکس کے ساتھ ساتھ ان کے فکر و رُوح پر بھی تاوان لگا رکھے تھے۔ بھاری ٹیکسوں اور محاصل کے علاوہ لوگوں سے کلیسا کی جاگیر پر بیگار لی جاتی تھی اور مذہبی لوگوں کے آگے توہین آمیز طریقہ پر جھکنا پڑتا تھا۔ نیز آسمانی باتوں کے نام سے چند مخصوص افکار و خیالات لوگوں پر مسلط کر رکھے تھے۔ اگر کوئی شخص ان باتوں سے اختلاف کرتا تو کافر و ملحد اور دین سے خارج قرار پاتا تھا۔

مُدتوں سے کُچلے ہوئے مقہور و مجبور عوام کو کلیسا سے اپنی تذلیل کے انتقام کا یہ نادر موقع میسّر آیا تھا چنانچہ وہ ڈاروِن کی انسان کی تحقیر کے باوجود اُس کی مدد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اور پھر لوگوں کا جوشِ جنوں اس حد پر نہ رُکا کہ انھوں نے صرف کلیسا کو تہس نہس کر دیا اور یہ سمجھنے لگے کہ کلیسا کتنا بھی مقدس کیوں نہ ہو۔ آخر ہے تو انسان کا بنایا ہُوا ڈھانچہ بلکہ معاملہ اس سے آگے بڑھ کر خود مذہب کو ختم کرنے اور مذہب کی تمام تعلیمات سے بیزاری تک پہنچ گیا۔ اور اس کے بعد یورپ مذہبی قیود سے آزاد ہو کر خالص رومی دَور میں واپس لوٹ گیا۔ یعنی ملحدانہ مادی بُت پرستی کے دَور میں اب یورپ کا ایمان مادی محسوسات اور محسوس حقائق کے دائرے میں محدود ہو گیا اور ساری تگ و دو صرف مادی اور فوراً حاصل ہوسکنے والی منفعت میں محصور ہو کر رہ گئی۔

اس کے بعد مادیت کی یہ لہر زندگی کے تمام پہلوؤں میں سرایت کر گئی۔ معیشت، سیاست، مذہب، اخلاق و روایات اور لوگوں کے آپس کے روابط و تعلقات۔ الغرض تمام شعبہ ہائے حیات مادیت کی زد میں آگئے۔

اس کے بعد تاریخ کی مادی تعبیر اور انسانی طرز و روش کی جنسی تفسیر کی جانے لگی۔ یہ مادی تعبیر و تفسیر بھی دراصل ڈاروِن کے ہی مفہوم کی توسیع تھی۔

تاریخ کی مادی تعبیر کا نتیجہ یہ برآمد ہُوا کہ پُوری انسانی زندگی کو محض مادی زندگی اور انسانی تاریخ کو تلاشِ رزق کی تاریخ قرار دیا جانے لگا۔

یہ نظریہ وجود میں آیا کہ مادی قوتیں ہی انسانی زندگی کی صورت متعین کرتی ہیں اور انسان کے افکار و عقاید کو تشکیل دیتی ہیں۔ افکار و عقاید بطورِ خود اقدار نہیں ہیں اور نہ یہ انسان کو حرکت میں لانے کا باعث ہیں اور نہ افکار و عقائد انسان کی عملی زندگی کی طرز و روش متعین کرتے ہیں۔ بلکہ یہ اقدار (افکار و عقاید) تو مادی اور اخلاقی تغیر کا نتیجہ اور اس تغیر سے وابستہ ہیں۔

اس دنیا میں دین، اخلاق اور روایات نام کی غیر متبدل اقدار کا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ کوئی چیز بھی ناقابلِ تغیر اور غیر متبدل نہیں ہے۔

ہر دَور میں اُس کے مزاج سے مناسبت رکھنے والے کچھ نظریات و اقدار ہوتے ہیں جو صرف اسی دَور سے مخصوص ہوتے ہیں اور دُوسرے کسی دَور کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے۔

دین اخلاق اور روایات جاگیردارانہ دور کے تصوّرات اور لوازمات ہیں صنعتی دَور میں دین، اخلاق اور روایات کا کوئی وجود نہیں، یہ آزاد دَور ہے اپنی مشین کی مانند آزاد۔ اس پر صرف مشین کا تسلط ہے اور یہ دَور اپنے مفاہیم و اخلاق خود پیدا کر رہا ہے جن سے دین کا کوئی واسطہ نہیں کیونکہ صنعت و سائنس کے اس دَور میں انسانیت ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہو چکی ہے۔ اسے مذہبی دیومالا اور خرافات کی اب کوئی ضرورت نہیں رہی۔ آج کی انسانیت ایسے محسُوسات کی دُنیا میں رہتی ہے جنہیں حواس سے دریافت کیا جا سکے۔ وہ ماورائی افکار جو حواس کی گرفت سے باہر ہیں آج کی انسانیت کے نشو و ارتقاء سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ یہ سب صحرائی دَور کی گلی سڑی باتیں ہیں جن کے واپس آنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔

اور انسانی روشِ حیات کی جنسی تعبیر نے انسان کے اعمال کو جنس کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

بچہ جنسی لذّت کے لیے دُودھ پیتا ہے، جنسی لذّت سے ہی بول و براز کرتا ہے جنسی لذّت سے ہی اپنا انگوٹھا چوستا ہے اور جنسی عشق سے ہی اپنی ماں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور جب باپ اس عشق کی راہ میں حائل ہوتا ہے تو عشقِ مادر کی اُلجھن (EDIPEES COMPLEX) پیدا ہوتی ہے جو بچہ کے ماں کی طرف جنسی مشاعر کو دبا دیتی ہے اور اسی دباؤ کے نتیجہ میں مختلف اقدار وجود میں آتی ہیں مثلاً مذہب، اخلاق، روایات اور ضمیر وغیرہ۔

لیکن ان سب اقدار کے پس پردہ حقیقی محرک جنسی جذبہ ہے۔

پھر یہی دباؤ اور گھٹن جس کی وجہ سے مذہب، اخلاق اور روایات وجود میں آتے ہیں، ایک نقصان رساں نفسیاتی عمل ہے جس سے نفسیاتی اور اعصابی بے چینی اور الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان الجھنوں کی وجہ سے انسان نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی قوتِ عمل برباد ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس گھٹن کو ختم کرنا ضروری ہے تاکہ انسان آزادیٔ مطلق کی فضا میں سانس لے سکے۔

تاریخ کی "مادی تعبیر" اور انسانی روش کی "جنسی تفسیر"۔ ان ہی دونوں تصورات کی بنا پر یورپ میں جو جدید تغیر و ارتقا برپا ہوا ہے اس کی بنیاد خالص حیوانیت ہے۔

ظاہر ہے جب انسان ڈارون کی تھیوری کے مطابق صرف ترقی یافتہ حیوان ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں تو یہی دونوں مادی اور حیوانی مفہوم جن کی ڈارون نے تاریخ پر تطبیق کی ہے اس حیوانی انسان سے مطابقت رکھتے ہیں۔

یورپ ڈارون کے کھودے ہوئے اس گڑھے میں ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہو کر گر گیا اور پھر اس نے زندگی کے تمام پہلوؤں میں ہر قسم کی روحانی، مذہبی اور اخلاقی اقدار کو پامال کر دیا۔ اس کی ساری زندگی جو انسان کی قیمتی متاع ہے صرف مادی ہو کر رہ گئی۔

چونکہ دین، اخلاق اور روایات نظریہ مادیت اور حیوانی لذت کوشی کے پنپنے کی راہ میں رکاوٹ ہیں اس لیے ان سب چیزوں (دین، اخلاق اور روایات) کو بہر حال اور بزور ختم کر دینا چاہیے۔ اور ان کو ختم کرنے کے سلسلے میں علم و سائنس کے تمام نظریات اور انکشافات و تجربات سے کام لینا چاہیے بلکہ ایسے علمی نظریات تخلیق کرنے چاہئیں جن سے ثابت ہو کہ دین خرافات ہے اخلاق انسانیت کے لیے نقصان دہ پابندی ہے اور روایات ایسا بوسیدہ لباس ہے جسے ترقی کی راہ پر گامزن بہادر نسل کو پھاڑ کر پھینک دینا چاہیے۔ اور ایسے نظریات بننے چاہئیں جن کی رُو سے جنس محض ایک حیاتیاتی (بایولوجیکل) عمل قرار

پائے جس کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر نوجوان مرد اور عورت کو جنسی استفراغ کے عمل میں مساوی طور پر حصہ لینا چاہیے جیسے وہ باہم مل کر کھانا کھاتے ہیں تاکہ ان کا نفس مطمئن ہو سکے اور اعصاب کو سکون حاصل ہو، اور دونوں کے ذہن مفید تخلیقی کاموں کے لیے آزاد ہو سکیں۔

پھر بڑی تیزی کے ساتھ پورے مغربی معاشرے پر یہ نظریات اس طرح چھاتے چلے گئے کہ کسی حد پر نہ رک سکے اور اہلِ یورپ کہنے لگے کہ اسی کا نام ترقی ہے اور یہ ایک تجربہ ہے جس کا راستہ کوئی طاقت نہیں روک سکتی اور جو لوگ اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں وہ نادان ہیں، رجعت پسند، پس ماندہ اور جامد ہیں۔ پھر مشرق کے طوطوں نے بھی یہی رٹ لگانا شروع کر دی۔ انھوں نے کبھی اپنے دل میں یہ بھی نہ سوچا کہ یہ نظریات اور تصورات درست بھی ہیں؟ اگر بالفرض یہ نظریات مغربی زندگی کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہیں تو مشرقی زندگی کے مزاج سے بھی ہم آہنگ ہیں یا نہیں؟ بعینہٖ اگر یہ مغرب میں وہاں کے حالات اور ماحول کا طبعی نتیجہ ہیں تو کیا مشرق میں بھی حالات اور ماحول کے تقاضوں سے ان کا کوئی واسطہ ہے۔

اہلِ مشرق نے یہ باتیں نہیں سوچیں کیونکہ ان کا ضمیر غلام تھا۔ اور غلام اپنے آقاؤں پر نہ جرح کر سکتا ہے اور نہ ان سے کچھ پوچھ سکتا ہے۔ بھلا یہ ممکن ہے کہ یورپ غلطی کرے۔ کہیں آقا بھی غلطی کر سکتے ہیں؟ کہیں غلام بھی آقاؤں سے زیادہ صاحبِ علم ہو سکتے ہیں؟

نہیں! ہرگز نہیں! ایسی باتیں سوچنا بھی نہیں چاہیے!

ہر بات ممکن ہے۔ مگر مغرب سے درآمدہ افکار و نظریات پر تنقید ممکن نہیں۔ ہم تنقید کیسے کر سکتے ہیں؟ مغرب کے پاس مشینیں ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہیں اس کے پاس علم ہے، سائنس ہے قوت ہے اور ہمارے پاس ان میں سے کوئی بھی چیز نہیں ہے بلکہ وہ تو ہمارا بھی مالک ہے اور ہم! ہم تو خود اپنی ذات کے بھی

مالک نہیں ہیں۔

ہرگز نہیں! ایسی باتیں سوچنا بری بات- بلکہ

اگر مغرب کہتا ہے کہ دین کوئی چیز نہیں تو دین کوئی چیز نہیں۔ اگر وہ کہتا ہے کہ اخلاق کچھ نہیں تو اخلاق کچھ نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ روایات کا کوئی وجود نہیں تو روایات کا کوئی وجود نہیں۔

کیونکہ اگر ہم ان باتوں کو تسلیم نہ کریں تو ہمیں رجعت پسند ہونے کا طعنہ سننا پڑے گا ہم سے کہا جائیگا کیا تمھیں ترقی، تہذیب اور عروج وارتقا کی ضرورت نہیں ہے؟ اگر ہے تو دین جیسی بوسیدہ خرافات کو چھوڑ دو، اخلاق کی فرسودہ پابندیوں سے آزاد ہو جاؤ اور روایت پرستی کے قابلِ شرم جمود سے نجات حاصل کرو۔

بندھنوں سے آزاد ہو جاؤ! آزادی کا مزا چکھو اور زنجیریں توڑ دو!

نوجوان لڑکو! اور لڑکیو! ان فرسودہ روایات کے خلاف بغاوت کر دو جن میں تم کو والدین نے جکڑ رکھا ہے۔ تمھارے والدین رجعت پسند ہیں اور تم مہذب اور ترقی پسند نسل ہو جو خرافات پر یقین نہیں رکھتی۔

تم ہر وہ کام کرو جو اہلِ مغرب کرتے ہیں، مخلوط دوستیاں، بوس وکنار، آزادانہ جنسی اختلاط، تاکہ گھٹی ہوئی جنسی طاقت خرچ ہو اور تمھارے اعصاب کو سکون مل جائے۔

دوسری طرف صلیبی سامراج ان طوطوں کا مذاق بھی اڑا رہا تھا اور غلاموں کی کارگزاری دیکھ کر خوشی سے از خود رفتہ ہوا جا رہا تھا۔

یورپ اگرچہ حیوانیت کے جنون میں مبتلا ہو کر اس بے کیف حیوانی پستی کو ترقی، تہذیب اور ارتقاع تو ضرور سمجھتا ہے لیکن اس کے باوجود یورپ تمام پہلوؤں کے اعتبار سے فساد میں مبتلا نہیں ہے۔ اس میں کچھ حقیقی خوبیاں بھی ہیں جن میں سب سے نمایاں "عمل"، "پیداوار" "تنظیم"، "محنت شاقہ کی برداشت" اور "جدوجہد پر استقامت" کی خوبیاں ہیں۔ ان کی یہ خوبیاں

ابھی تک اخلاقی فساد اور رسوا کن حیوانیت کی زد میں نہیں آئیں (اگرچہ فرانس اور چند دیگر یورپی ممالک اس اخلاقی فساد اور حیوانیت کے قطعی نتائج سے دوچار ہو چکے ہیں اور ان کا وجود تباہی کے کنارے آلگا ہے)۔

لیکن غلام مشرق میں یہ فضائل کہاں موجود تھے کہ وہ اس ترقی کا بارِ گراں برداشت کر سکتا اور فوراً تباہ نہ ہو جاتا۔ مشرق کا تو یہ حال ہے کہ پہلے ترکوں کی حکومت کے زیرِ سایہ اسے شدید نقصان پہنچا۔ پھر رہی سہی کسر سامراج نے پوری کر دی اور اہلِ مشرق کی وہ خوبیاں جو انھوں نے اسلام سے اس وقت لی تھیں جب اسلام ایک فعال اور زندہ قوت تھا اور علم وعمل، انتاج و فتح اور توسیع غرض زندگی کے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے روئے زمین پر چھایا ہوا تھا وہ بھی تباہ وبرباد ہو چکی تھیں۔

دراصل مشرق کو اس ترقی کی نہیں ایک اور قسم کے انقلاب وارتقاء کی ضرورت تھی جو اسے اس کی سلب شدہ انسانیت اور گم گشتہ قوت سے دوبارہ ہمکنار کر دے اور اسے از سرِ نو اخلاق وروایات کے ان حقیقی اصولوں پر استوار کر دے جو نفس کی اندرونی دنیا کے لیے حیات بخش قوت ہیں اور خارج کی واقعی دنیا میں بھی ایک حقیقی طاقت ہیں۔

سامراج جن اسلامی تحریکوں کو مٹانے کا حریص رہا ہے۔ ان تحریکوں کا مقصد بھی دراصل ایسا ہی انقلاب لانا تھا مگر صلیبی سامراج بڑی چابکدستی سے (اس انقلاب کی بجائے) حیوانی ترقی کے لیے مشرق کے دروازے کھولتا رہا اور اس کی راہ ہموار کرنے اور ہر طرف اس کا زہر پھیلانے کے لیے اپنے پہلے سے تربیت کردہ دانشور غلاموں کو اجرت دے کر اس تہذیب وترقی کا ڈھول پٹواتا رہا۔

ہم یورپ کی نام نہاد ترقی کا ایک بار پھر جائزہ لیتے ہیں۔ ڈارونی نظریات کی وجہ سے انسان میں دنیوی مال ومتاع اور لذت کوشی کی رغبت میں شدید اضافہ ہو گیا۔ اگرچہ یہ رغبت کوئی نئی چیز نہیں بنیادی مال کی رغبت اور لذت کوشی کا میلان انسانی فطرت میں زمانہ

قدیم سے موجود ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ (۱۴، آل عمران) "لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس۔ عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں۔ بڑی خوش آئند بنادی گئی ہیں۔ مگر یہ سب چیزیں دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔" یہ درست ہے کہ دنیاوی فوائد کی محبت کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن مذاہب اور مذہب کی روحانی قدریں اس فطری جذبہ کو متوازن رکھنے کے لیے ان سے کچھ اعلیٰ اور ابدی اقدار بھی ان کے ساتھ انسان کو عطا کرتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے ارشادِ باری تعالیٰ: ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ ۝ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ ذَٰلِكُمْ ۚ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِنَ اللَّهِ (۱۵) آل عمران: "مگر یہ سب دُنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو! میں تمھیں بتاؤں کہ ان سے اچھی چیز کیا ہے۔ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہاں انھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی۔ پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے سرفراز ہوں گے۔"

مذہبی زندگی میں بالخصوص اسلامی نقطہ نظر سے پاکیزہ طریقے پر لذّت حاصل کرنے کو بڑی حد تک جائز اور برحق قرار دیا گیا ہے۔ صرف یہ شرط رکھی گئی ہے کہ حصولِ لذّت کے لیے نفس میں ایسا فساد پیدا نہ ہو کہ انسان بے حیا ہو کر اسی رَو میں بہ جائے اور مقامِ انسانیت سے گر کر حیوانی سطح پر آجائے۔

لیکن یورپ ترقی کے اس جنون میں مذہب کے دائرے سے یکسر باہر نکل گیا اور

اس نے اِن تمام قیود وضوابط کو بھی توڑ دیا جو حصولِ لذّت و نفع کی اس رغبت کو کنٹرول کرتے تھے۔

یورپ میں لذّت کوشی کی ابتدا جنس سے ہُوئی مگر وہ اس حد پر نہیں رُکا اور ایسا ہونا قدرتی امر تھا کیونکہ اس زمین پر پُوری تاریخ میں سنّت اللہ یہی ہے کہ تاریخِ عالم کی تہذیبوں میں سے جس تہذیب میں بھی دنیاوی لذّت کوشی کی رغبت حد سے زیادہ بڑھی اس کی ابتدا جنسی لذّت سے ہُوئی اور پھر یہ رغبت زندگی کے تمام شعبوں میں سرایت کرتی چلی گئی اور بالآخر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تہذیب عیش کوشی اور حیوانی پستی کی انتہا کو پہنچ گئی۔

یورپ میں بھی ترقی کی اس طوفانی لہر کا یہی نتیجہ برآمد ہُوا اور صنعتی ترقی اور ذرائع پیداوار میں فنی اور سائنسی پیش رفت نے اس فساد میں تیزی سے اضافہ کیا۔

پوری زندگی جدید صنعت و تہذیب کی رنگینیوں سے لبریز ہوگئی۔ سینما، ریڈیو، ٹیلی وژن، چمکیلی کاریں، خوبصورت فرنیچر اور آرام دہ بستر، الغرض صنعت نے زندگی کو آراستہ اور خوبصورت بنانے اور دِل کش چکا چوند پیدا کرنے والے اور للچانے والے انداز میں پیش کرنے میں اپنے تمام تر وسائل و ذرائع سے کام لیا۔ یہ طرزِ زندگی بذاتِ خود معیوب نہیں ہے بلکہ اصل خرابی ان اقدار میں ہے جو زندگی پر حکمران ہو چکی ہیں۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کی پیداوار (سامانِ تعیش) کو مسلسل بڑھانے میں لگے ہُوئے ہیں اور وہ لوگ جو اس پیداوار کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں ان سب کی نظر میں زندگی کا مقصد آخر کیا ہے؟

ہم اس موقع پر سرمایہ داری اس کے طریقۂ پیداوار اور اس کے استحصالی مقاصد کے بارے میں کسی نظری اور فکری بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ سرمایہ داری اپنے ہتھکنڈوں سے نفع کا بڑا حصہ سرمایہ داروں کی جیب میں پہنچا دیتی ہے وغیرہ۔

ہماری نظر میں یہ مسئلہ اس سے کہیں زیادہ گہرا اور دُور رس ہے۔

اس لیے کہ جب تک سرمایہ داری کا مقصدِ وحید بقولِ اشتراکیت صرف حصولِ نفع ہے تو سرمایہ دار اگر خریداروں میں اپنی پیداوار کا اتنا ذوق و شوق اور رغبت نہ پاتے تو اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دُوسرے ذرائع سے کوشش کرتے۔

تو گویا اصل مسئلہ لذت کوشی کی بڑھی ہُوئی رغبت کا ہے۔ جس نے یورپ میں انسان کے بارے میں مادی اور حیوانی تعبیر کے زیرِ سایہ جنم لیا اور جسے عالمی صیہونیت نے غیر یہودی قوموں یعنی امیوں یا امیتیوں (جیسا کہ وہ دُوسروں کو کہتے ہیں) کو تباہ و برباد کرنے کے لیے پھیلایا ہے تاکہ جس دن صیہونیت اقوامِ عالم کو شہوتوں کی بیڑیوں میں مکمل طور پر جکڑنے میں کامیاب ہو جائے یہودیوں کو ان پر پُورا تسلط حاصل ہو جائے[1]۔

بہرکیف معاملہ کی نوعیت کچھ بھی ہو ایک بات واضح ہے کہ لذت کوشی کی بڑھتی ہُوئی رغبت تہذیبِ جدید کا امتیازی نشان بن چکی ہے اور یہ تہذیب پوری دنیا میں اسے پھیلا رہی ہے۔ اور خواہ قوموں کی زندگی میں اس کے فوری یا مستقبل میں مرتب ہونے والے نتائج کچھ بھی ہوں (جیسا کہ جنگِ عظیم ثانی میں فرانس تباہ ہُوا اور دُوسرے ممالک میں بھی مسلسل اس کے نتائج ظاہر ہو رہے ہیں) ہمارے نزدیک اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ رغبتِ لذت کوشی کی یہ وبا جہاں جہاں پہنچ رہی ہے ان سب ممالک میں روحانی، مذہبی اور اخلاقی تصورات پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

دینی رُوح اور حد سے بڑھی ہوئی لذت کوشی کی رغبت میں واضح تضاد ہے۔ یہ تضاد اس بنا پر نہیں کہ مذہب۔ بالخصوص اسلام حصولِ لذت کو حرام قرار دیتا ہے یا اس کا مخالف ہے۔ اسلام تو کہتا ہے: قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط (۳۲) الاعراف: "اے محمدؐ! ان سے کہو، کس نے اللہ کی اس

زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہُوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں" بلکہ یہ تضاد اس لیے ہے کہ حد سے زیادہ لذت کوشی نفس میں فسادؔ اور سہل انگاری پیدا کر دیتی ہے اور انسان کو دنیا سے اس قدر محبت ہو جاتی ہے کہ وہ آخرت کو فراموش کر دیتا ہے اور عقیدۂ آخرت کی بنیاد پر عاید فرائض اور ذمہ داریاں بھول جاتا ہے اور ان پابندیوں سے نفرت کرنے لگتا ہے جو اسے لذت کوشی سے محروم کریں۔

اور یہ حادثہ وقوع پذیر ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ جب بھی نفسِ انسانی لذت کوشی میں مبتلا ہو جاتا ہے دین کے دائرے سے دُور ہٹتا چلا جاتا ہے اور دینی قیود و ضوابط سے نفرت کرنے لگتا ہے اور انسان کے دل میں یہ آرزو پیدا ہونے لگتی ہے کہ یہ پابندیاں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں یا کم از کم نرم ہو جائیں تو کتنا اچھا ہو۔

سامراج کے زیرِ سایہ عالمِ اسلام میں جوں ہی تمدن کی لہر آئی اس کے ساتھ ہی لذت کوشی کی حد سے بڑھی ہُوئی رغبت بھی تہذیب اور ترقی کے نام پر ان ممالک میں پھیلتی چلی گئی۔ دراصل لذت کوشی کی حد سے بڑھی ہُوئی رغبت نفس میں پوشیدہ عقیدے کو تیزاب کی طرح کھا جاتی ہے۔

اسلام ان وسائلِ راحت کو حرام قرار نہیں دیتا جن سے وقت اور محنت کی بچت ہو، مثلاً موٹر کار، ہوائی جہاز، ریل، ریفریجریٹر، کپڑے دھونے کی مشین اور روٹی پلانٹ وغیرہ۔ اسلام بنیادی طور پر سینما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بھی خلاف نہیں ہے لیکن اسلام عیاشی اور سہل انگاری کی رُوح کا دشمن ہے اور اس اخلاقی بے راہ روی کا مخالف ہے جو اس دَور کے موجودہ سینما اور ریڈیو پھیلا رہے ہیں اور جو انسانی زندگی کو اس انداز میں پیش کر رہے ہیں جیسے محض بھڑکتی ہوئی پست جنسی خواہشات کی تسکین کا ایک موقعہ ہے۔

بہرکیف کچھ بھی ہو ایک بات بہت واضح ہے اور وہ یہ کہ یہ تیزاب مغرب سے

پھیلتا ہوا مشرق میں پہنچ گیا اور یہاں اس کو ارتقا، تہذیب اور تمدن کا نام دیا گیا، اور اسلام کی تباہی کے لیے جو عوامل پہلے سے کارفرما تھے ان میں مزید اضافہ ہو گیا۔

اور اب ہم عورت کے موضوع کو لیتے ہیں

عورت کے سلسلے میں تحریکِ آزادئ نسواں، تحریکِ مساوات اور بے پردگی کی تحریک، غرض متعدد تحریکیں موجود ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ ہم نے اپنی کتاب "معرکۃ التقالید" میں خاص طور پر نیز "شبہات حول الاسلام" اور "التطور والثبات" میں اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

یہاں صرف اتنا بتانا کافی ہے کہ یورپ میں یہ تحریکیں وہاں کے اقتصادی اور معاشرتی حالات کا منطقی نتیجہ تھیں لیکن اگر اہلِ یورپ کے نظریات وہ نہ ہوتے جو اس وقت ہیں تو کوئی ایسا جبر موجود نہ تھا کہ یورپ میں ان تحریکوں کی وجہ سے وہ صورتِ حالات پیدا ہوتی جو اب ہے۔ اور یہ تو قطعاً ضروری نہ تھا کہ یورپ کی سی صورتِ حال اسلامی ملکوں میں بھی پیدا ہوتی کیوں کہ ان ممالک میں تو وہ اسباب و حالات قطعاً موجود ہی نہ تھے۔

دوسری بات۔ جو ہم اپنی دیگر تصانیف میں بھی کہہ چکے ہیں، یہ ہے کہ معاملے کے دو پہلو ہیں اور دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک یہ کہ اس ظلم کو ختم کیا جائے جو مسلمان عورت پر اسلامی احکام کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے جاہل، غلام اور حیوانوں کی سی حالت میں رکھنے کی وجہ سے واقعتاً اس پر ہو رہا ہے اور دوسرا یہ کہ ظلم کو ختم کرنے کے لیے ایسا ذلیل طریقہ اختیار کیا جائے جو نہ صرف معاشرے میں فساد پیدا کر دے بلکہ اس کی وجہ سے خود عورت کی حیثیت بھی اس سے زیادہ نہ رہ جائے کہ وہ جسمانی لذت کا سامان ہے جس کو موقع میسر آئے اس سے لطف اندوز ہو لے۔

دراصل یورپ میں آزادئ نسواں کا شاخسانہ اس وقت شروع ہوا جب "ترقی یافتہ"

صنعتی معاشرے میں مرد نے عورت کی کفالت سے بزدلانہ گریز کیا چنانچہ عورت اپنی کفالت اور بسا اوقات خاندان کی کفالت کے لیے کام کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس وقت کارخانہ داروں نے اس کا استحصال کیا اور اسے مرد کے مقابلے میں نصف اجرت دی حالاں کہ عورت بھی اسی کارخانے میں مردوں کے ساتھ اتنے ہی گھنٹے کام کرتی تھی جتنے گھنٹے مرد کرتے تھے۔

اور یہ ایسا بے نظیر انصاف تھا جس کو صرف یورپ کا بلند، ترقی یافتہ اور شریف ضمیر ہی برداشت کر سکتا ہے۔

اندریں حالات عورت کے لیے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اپنے فطری اور منطقی حق کا مطالبہ کرے چنانچہ عورت نے اس مقصد کے لیے ہڑتال، مظاہرے، پروپیگنڈے اور ابلاغ کے تمام ممکن ذرائع اور وسائل سے کام لیا لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے اسے قانون سازی میں بھی شریک ہونا پڑے گا تاکہ وہ اپنی مصلحتوں کے مطابق قانون بنوا سکے کیونکہ یورپ میں اصحابِ اغراض قانون سازی کے ذریعہ ہی دوسروں کا استحصال کرتے ہیں۔ اسلام کی طرح وہاں قانونِ الٰہی نافذ نہیں ہے جس میں اللہ کے تمام بندوں کا خیال رکھا گیا ہو چنانچہ پہلے عورت نے حقِ انتخاب، پارلیمنٹ کی ممبری اور تنخواہوں اور تعلیم میں مساوات کا مطالبہ کیا پھر اس کے مطالبے بڑھتے چلے گئے اور کئی اور طرح کی برابریوں کے مطالبے ہونے لگے۔

طبقۂ نسواں کے ان مطالبوں پر مرد نے نہ صرف احتجاج کیا بلکہ اس مقصد کے لیے دین اور روایات کا سہارا لیا اور باوجودیکہ مرد خود دین و روایات کو پسِ پشت ڈال چکا تھا، اس نے عورت کی مزاحمت روکنے کے لیے ان ہتھیاروں سے کام لینا پسند کیا۔

اور یہ ایک فطری اور منطقی بات تھی کہ جس فضا میں یورپ زندگی گزار رہا تھا اور جس قسم کے پست اور بگڑے ہوئے نظریات اس پر مسلط تھے عورت بھی دین و روایات سے آزاد

ہونے اور اس اخلاقی فساد کو اختیار کرنے میں (جس کی مرد خود تو بے تحاشا مشق کر رہا تھا اور عورت کو روایات کے نام پر ان سے روکتا تھا) مرد کے ساتھ برابری کا مطالبہ کرے۔

چنانچہ یورپ کی عورت نے اپنے تمام حقوق یکے بعد دیگرے حاصل کر لیے اور اس کے ساتھ ہی فساد اور گناہ کا حق بھی حاصل کر لیا۔

یہ آخری حق عورت نے مرد کی مدد اور جرأت آموزی سے حاصل کیا تھا۔ مرد کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اس طرح ناپاک لطف اندوزی اس کے لیے آسان ہو جائے گی اور حصولِ مقصد کے لیے صرف حالات کو سازگار بنانے کی ضرورت ہوگی

اس کے بعد عورت دکانوں، کارخانوں اور بازاروں میں پہنچ گئی اور بیک وقت کمانے بھی لگی اور فتنہ آفرینی بھی کرنے لگی۔

فرائڈ کی جنسی تعلیم، حد سے بڑھی ہوئی لذت کوشی کی رغبت اور صیہونیوں کی "امیتیوں" یا "امیتیوں" کو تباہ کرنے اور شہوتوں کے ذریعہ ان پر غلبہ پانے کی خفیہ ریشہ دوانیوں کے زیر سایہ عورت نے دل کشی اور فتنہ سامانی کے تمام ہنر سیکھ لیے۔

بات دراصل سیکھنے سکھانے کی نہیں ہے اس کی اسے ضرورت ہی کیا تھی، خود کو بنا سنوار کر دوسرے کو اپنی طرف راغب کرنا اور اس کے لیے تمام حربوں سے کام لینا عورت کی فطرت ہے[1]۔ لیکن اختلافِ فکر و نظر اور معاشرتی فرق کی بنا پر یہ حربے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ دوسرے بن سنور کر پسندیدہ بننا اور فتنہ آرائی دو مختلف چیزیں ہیں۔ پہلی چیز پاکیزہ اور جائز ہے جبکہ فتنہ سامانی نہ جائز ہے نہ پاکیزہ۔

لیکن یورپ میں تہذیب و ترقی کا سیلاب پاکیزہ طریقے اختیار کرنے کے لیے تیار نہ تھا

---

[1] پسندیدہ بننا مرد اور عورت دونوں کی فطرت ہے لیکن عورت جب تک مذہب اور روایات کے زیر اثر مہذب نہ بن جائے جسم کے ذریعہ پسندیدہ بننے کی طرف زیادہ مائل رہتی ہے۔ (مصنف)

وہ تو فرائڈ سے یہ سبق پڑھ رہا تھا کہ انسانی فطرت میں "نظافت" نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اور یہ کہ نظافت و پاکیزگی ایک گھٹن (SUPPRESSION) ہے جو انسانی وجود کے لیے تباہ کن ہے

اس لیے عورت کو اپنے غلیظ ترین ہتھیاروں کے ساتھ میدان میں آجانا چاہیے اور اپنے تمام دلکشی کے حربوں سے کام لینا چاہیے۔ اور اگر اس کا کوئی اور مقصد مثلاً عاشق یا خاوند حاصل کرنا نہ بھی ہو تو دل کشی اور فتنہ سامانی بذاتِ خود مقصد ہے۔

گویا فتنہ سامانی اور دل کشی مرد کو بہکانے اور مائل کرنے کے لیے۔ اور اس غرض سے کہ عورت یہ محسوس کرے کہ وہ جذب و کشش رکھتی ہے اور مرد پر غلبہ حاصل کر سکتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ عورت کو یہ غلبہ حاصل ہو گیا۔

اس لیے کہ اگر مرد ڈارون کا حیوان نما انسان ہے۔ اور اگر مرد "فرائڈ" کے فلسفہ کے مطابق ہر پابندی سے آزاد جنسی شہوت کے زیرِ تسلط ہے اور اگر مرد میں حد سے بڑھی ہوئی لذت کوشی کی رغبت موجود ہے تو ظاہر ہے اس قماش کے مرد پر ہمیشہ شہوانی قوتوں کا قبضہ رہے گا۔ اور جسمانی شہوت برانگیختہ کرنے والی ہر چیز اس کی زندگی پر حکومت کرتی رہے گی۔

یہی وجہ ہے کہ دل لبھانے والی اور پرکشش عورت ہی اس مرد کے اعصاب پر سوار ہے اور عورت نے بھی اپنی فطری ذہانت سے یہ بات محسوس کر لی ہے کہ جتنا اس کی دل کشی اور جاذبیت میں اضافہ ہوگا اتنا ہی اس بوالہوس مرد پر اسے غلبہ و اقتدار حاصل ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ دل کشی اور دلربائی بذاتِ خود عورت کے نقطۂ نگاہ سے ایک مقصد بن گیا اور یہ ضروری نہیں رہا کہ اسے وہ خاوند یا عاشق حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے بلکہ اب یہ محض بلا امتیاز ہر مرد کو لبھانے کا ایک حربہ ہے یا زیادہ سے زیادہ اس کی وجہ سے عورت کو یہ احساس رہتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی مرد کے دل میں موجود ہے۔

عورت کی زندگی ایک ایسے جواری کی زندگی بن کر رہ گئی ہے جسے محنت و مشقت بھی کرنا پڑتی ہے اور اس کی بدبختی کہ اسے کام اور محنت کا پورا معاوضہ بھی نہیں ملتا لیکن اس بدبختی

کا معاوضہ وہ اس غلبہ کو خیال کرتی ہے جو اسے دلکشی اور دلربائی کی اداؤں سے مرد پر حاصل ہوتا ہے یا اس کا معاوضہ عورت کا یہ احساس ہے کہ وہ مردوں کے دلوں میں بستی ہے۔

اپنی دل کشی کے حربوں سے مرد پر غلبہ پالینے کی وجہ سے عورت خود اس بُری طرح فتنہ میں مُبتلا ہُوئی کہ پھر اس میں سے نہ نکل سکی اور اس فتنے کو پھیلانے کے لیے عُریاں فلموں، فحش نشریات، اخلاق باختہ ڈراموں اور افسانوں اور بے حیائی سے بھرپُور صحافت کے علاوہ بھڑکانے اور ورغلانے کے تمام دیگر ذرائع سے اتنا شیطانی پروپگنڈا کیا گیا کہ ہر جگہ فتنہ پھیل گیا اور پُوری دنیا قحبہ خانہ بن کر رہ گئی۔

یہ ہے یورپ کی وہ ترقی جسے اہلِ یورپ تہذیب وارتقا کا نام دے کر پُوری انسانیت پر مسلط کر رہے ہیں اور جس کی وجہ سے دین، اخلاق اور روایات کا بچا کھچا حصّہ بھی اگر ہیں کسی قدر باقی رہ گیا ہے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ترقی کی یہ لہر اسلامی دُنیا میں بھی پہنچتی جو پہلے ہی یورپ کے زیرِ نگیں تھا اور ہر قسم کے فتنہ وفساد کے آگے گھٹنے ٹیک چکا تھا۔

یورپ سے آنے والی آزادیٔ نسواں کی تحریک کے ساتھ وہاں کا فیشن بھی اسلامی ممالک میں در آیا جسے بغیر نقد و تبصرہ کے اختیار کر لیا گیا اور سامراج ملّتِ اسلامیہ کے وجود کو ختم کرنے کی غرض سے اس فیشن کی سرپرستی اور پُشت پناہی کرتا رہا جیسا کہ مشنریوں کے اقتباسات سے جو ہم پہلے پیش کر چکے ہیں ثابت ہوتا ہے، آزادیٔ نسواں کی تحریک کے ساتھ ساتھ مغرب سے فتنہ سامانی اور دلکشی کے سارے رنگ ڈھنگ بھی اسلامی دنیا میں پہنچ گئے۔ کیوں کہ وہاں تو ہر چیز پہلے ہی تیار موجود تھی تاکہ موقع ملتے ہی جہاں ضرورت ہو پہنچا دی جائے۔

چنانچہ مُسلمان عورت نے بھی دلربائی اور فتنہ سامانی کے تمام حربے سیکھ لیے کیونکہ اسے اس کے اپنے شہر اور اپنی زبان میں فحش فلموں، عُریاں صحافت و نشریات اور افسانوں کی شکل

میں وہ سارا مواد مل گیا جس سے وہ دُوسروں کو لُبھانے اور ورغلانے کا فن سیکھ سکے اور خود بھی بہک کر اس فن میں طاق ہو جائے۔

پھر مسلمان عورت کو اخبارات و رسائل میں عورت کے موضوع پر ایسے لکھنے والے مرد اور خواتین بھی مل گئے جو اسے بہت تفصیل سے بتانے لگے کہ عورت کس طرح جاذبِ نظر بلکہ درحقیقت فتنہ پرور بن کر مرد کو ورغلا سکتی ہے اور اس پر اقتدار پا سکتی ہے گھر اور بازار میں بہکانے اور ورغلانے کے کیا انداز ہیں۔

گفتگو اور اداؤں سے کس طرح لُبھایا جا سکتا ہے۔

لباس اور بناؤ سنگھار کیسے دُوسرے کو مائل کرنے اور دل کشی کا سبب بنتا ہے چال ڈھال نشست و برخاست اور نظر بازی میں کن کن طریقوں اور حربوں سے کام لیا جاتا ہے اور اب حال یہ ہے کہ مردوں کو ورغلانا اور اپنی طرف مائل کرنا ہی بذاتِ خود مسلمان عورت کا بھی مقصد بن گیا ہے وہ اپنی دل کشی اور دلربائی کو خاوند حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں سمجھتی علاوہ ازیں آزادیٔ نسواں کے علمبردار صحافیوں اور مصنفوں کی ترغیب و جرأت آموزی سے اسے اپنے لیے چاہنے والے (بوائے فرینڈز) حاصل کرنے کا حق بھی مل چکا ہے۔ مسلمان عورت کی زندگی میں بھی ورغلانے اور مائل کرلے کی مہم کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ اسے یہ احساس ہو کہ وہ اسی قدر زندہ اور موجود ہے جتنا وہ سرِراہ یا دفاتر میں مرد کے سامنے اپنے فنونِ دل کشی و دل رُبائی میں مہارت کا مظاہرہ کر کے انھیں ورغلا سکتی ہے۔ بلکہ مسلمان عورت بے حیائی میں مغربی عورت سے بھی بازی لے گئی کیونکہ اُس وقت کا مشرقی معاشرہ انتہائی انتشار کا شکار تھا اور تمام قاعدے اور قانون ڈھیلے ہو چکے تھے اور دلوں کے اندر بھی کوئی مقصدِ حیات موجود نہ تھا۔

اور اس طرح اس دین کے باقی ماندہ حصّے کو ختم کرنے کا آخری باب بھی مکمل ہو گیا عالمِ اسلام بلکہ پوری دُنیا کی اس وحشت ناک سرگزشت کے بعد اور اسلامی عقیدہ

کو ختم کرنے کی جو بھرپور اور ذلیل کوششیں کی گئی ہیں جن میں رُوئے زمین کی تمام قوتوں نے پُورا پُورا حصہ لیا ہے۔ اس کے بعد بھی کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ زمین کے کسی گوشے میں اسلام اور مسلمان باقی رہ گئے ہوں گے۔؟

ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی مسلمان مرد یا عورت موجود ہو کیونکہ وہ تمام تخریبی قوتیں جو اس سلسلہ میں کارفرما رہی ہیں ان کا مقصد ہی یہ تھا کہ زمین کے ہر گوشے میں مسلمان کے لیے زندہ رہنا ناممکن بنا دیا جائے یا اگر کہیں کچھ مسلمان پھر بھی بچ رہیں تو اس سرزمین کو ان کے لیے جہنم بنا دیا جائے۔ ہر اعتبار سے جہنم — ظلم و ستم کا جہنم — تنگ حالی اور پریشانی کا جہنم — بلکہ نفسیاتی، روحانی، فکری، اور معاشرتی اعتبار سے بھی ایک ایسی اجنبیت کا جہنم بنا دیا جائے جو اسے ہر طرف غیر مسلم معاشرہ موجود ہونے کی وجہ سے برداشت کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ ٹھکرائے جانے، تحقیر و تذلیل اور نفرت و تمسخر کا جہنم۔ اور مسلمان عورت کے لیے تو بالخصوص جہنم ہو کیونکہ وہ اپنے بہت ہی منفرد اور نمایاں طور پر اجنبی لباس کی وجہ سے ایک نیم برہنہ اور ہر پابندی سے آزاد معاشرے میں رہتے ہوئے ہر قسم کے تمسخر و تذلیل کا نشانہ بنے گی۔

یقیناً یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ان تمام حالات کی موجودگی میں کوئی ایک شخص بھی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہنے والا باقی رہے۔

لیکن اس کے باوجود اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ مستقبل پھر بھی یقیناً اسلام ہی کا ہے تو کیا آپ کو تعجب ہوگا اور حیرت کے باعث پریشان ہوں گے؟

اسلام کا مستقبل

آنے والا دَور اسلام کا دَور ہوگا

اسلام کو کچلنے کے لیے جس قدر تباہ کُن کوششیں بروئے کار لائی گئیں اور اسلام کو ختم کرنے کے لیے داخلی عوامل کے علاوہ عالمی موثرات بھی جس بڑے پیمانے پر کارفرما رہے ہیں ان ہی سب امور کا جائزہ ہم نے اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ اس جائزے کو سامنے رکھتے ہوئے کیا کوئی شخص مندرجہ بالا بات کو صحیح تسلیم کرنے پر تیار ہوگا؟

جی ہاں! یہ واقعہ ہے صلیبی سامراج نے اسلام کو ختم کرنے کی مقدور بھر کوششیں کیں، دنیائے اسلام کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کیا۔

پھر ہر چھوٹی اسلامی ریاست کو دُوسری اسلامی ریاست سے جُدا رکھ کر ان کے درمیان ایک دُوسرے کے خلاف نفرت اور عداوت کے بیج بوئے۔

ہر اسلامی ملک میں دین کو معاشرے سے اور شریعت کو زندگی سے علیحدہ کر دیا۔

ہر اس تحریک کو کچل دیا جو احیائے اسلام کے لیے اٹھی اور جس نے اسلام کو از سرِ نو تعمیری اور فعال قوت بنانا چاہا۔

ایسی تعلیمی پالیسیاں ترتیب دیں جو نوخیز جوانوں کو اسلام کے سرچشموں سے دُور کر دیں اور ان کے ذہنوں میں اسلام کے بارے میں شبہات کے علاوہ کچھ نہ رہے۔

ہر اسلامی ملک میں دانشوروں کی ایسی کھیپ تیار کی جو اسلام سے بے بہرہ اور دین سے متنفر ہو۔ اور اسلام کو جمُود، پس ماندگی، رجعت پسندی اور انحطاط خیال کرے۔

دانش وروں کے طبقہ میں اگر کوئی ایسی تحریک پیدا ہوئی جو اسلام کی طرف رجوع کے لیے آواز اٹھائے تو اس تحریک کو بُری طرح کچل دیا کیونکہ اس کے معنی تھے کہ صلیبی سامراج نے دو صدیوں تک جو جدوجہد کی تھی وہ بے کار چلی جائے۔

اور سامراج اپنی ان تمام کوششوں میں کامیاب بھی ہوگیا۔

اس نے مسلمانوں کو دین سے نہ صرف دُور کر دیا بلکہ اسلام سے کُلّیتہً خارج کر دیا۔ اگرچہ ان کے نام ابھی تک مسلمانوں جیسے ہیں اور ایک ایسے اسلام کے دعویدار بھی ہیں جس کا حقائق کی دنیا میں کوئی وجود نہیں ہے۔

سامراج ہر اس اسلامی تحریک کو بھی ناکام بنانے میں کامیاب ہوگیا جو مشرقی ملکوں میں مسلمانوں کو اسلام کی طرف واپس لانے کے لیے اٹھتی رہی۔

پھر کیا ہُوا؟

ہُوا یہ کہ خود امریکہ میں جس نے اسلام کے مقابلے کے لیے اربوں ڈالر مشنریوں پر خرچ کیے تھے اسی امریکہ کے سیاہ فام باشندوں میں اسلامی تحریک اٹھی جس کے متبعین تقریباً ڈھائی لاکھ افراد ہیں۔

امریکہ نے ان سیاہ فام باشندوں کو پابندِ سلاسل کر دیا اور قید خانوں میں ان پر ظلم و ستم ڈھائے۔ جیسا کہ خود امریکی اخبارات لکھتے ہیں۔ لیکن اسلامی دعوت جیلوں میں بھی پھیلتی رہی۔ اور امریکی اخبارات کے مطابق چونکہ یہ لوگ مسلمان تھے انھوں نے اپنے مقاصد کی راہ میں ہر قسم کی تکالیف اور مشقتیں برداشت کیں اور کسی قسم کا ظلم اور جبر انھیں اپنے مقصد سے نہ ہٹا سکا۔

اور پھر؟

پھر امریکا جس نے افریقہ میں اسلامی سیلاب کو روکنے کے لیے بے اندازہ دولت خرچ کی تھی اس بات پر مجبور ہوگیا کہ خود اس کے ایجنٹ اسلام کا علم بلند کریں تاکہ افریقہ

کے مسلم علاقے کم از کم اس کے ایجنٹوں کے ہاتھوں میں ہی رہیں کیونکہ اسلامی تحریکوں نے ان کی تمام مشنری کوششوں کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

ظاہر ہے اس ارادہ خداوندی کے آگے کہ اللہ نہیں چاہتا کہ زمین پر اس کا نور بجھ جائے۔ انسان کی کیا پیش جا سکتی ہے:

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ۔ الصف (۸) "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (اسلام) کو پھونک مار کر بجھا دیں۔ حالانکہ اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا گو کافر کیسے ہی ناخوش ہوں"

عالمِ اسلام اور مسلمانوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم اس وقت صرف مغربی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں جسے یہ ترقی کا ریلا اپنی رَو میں بہا کر لے گیا ہے

آج پُورا مغرب جس بھیانک رُوحانی افلاس سے دوچار ہے اس کے ہمیشہ کے لیے باقی رہنے کا صرف اسی صورت میں امکان ہے جب اللہ تعالیٰ کی مشیت اس دَور میں انسانیت کو یکسر ختم کرنے کا فیصلہ فرمالے۔

لیکن اگر مشیت کی تقدیر یہ ہے کہ انسانی زندگی کچھ مدّت کے لیے مزید باقی رہے تو انسان اپنی غفلت سے ضرور بیدار ہوگا اور انسانیت جس جہنم میں گرتی جا رہی ہے اس سے نکلنے کی ضرور کوشش کرے گی۔

اور واقعہ یہ ہے کہ انسانیت ہوش میں آ رہی ہے۔

اس نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ اس کی زندگی میں ایک خلا ایسا ہے جسے کوئی چیز پُر نہیں کر سکتی، نہ اقتصادی اور سیاسی نظام نہ معاشرتی تنظیمیں اور نہ جنس اور نہ آسائش و آرام کی وہ بے پایاں لذتیں جو آج کے دَور میں اتنی فراواں ہیں کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھیں اس خلا کو پُر کر سکتی ہیں۔

دراصل یہ رُوح کا خلا اور عقیدے کا کھوکھلا پن ہے۔

اس خلا کی نشان دہی اس بے اطمینانی سے ہوتی ہے جو لوگوں پر مسلط ہے اور جس کا نتیجہ نفسیاتی اور اعصابی اضطراب، فشارِ خون، خودکشی اور دیوانگی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے اور ان تمام سہولتوں اور لطف و کیف کے مواقع کے باوجود جو صنعتی تہذیب و تمدن نے اس وقت انسان کو مہیا کر رکھے ہیں ظاہر ہو رہا ہے۔ بلکہ حقیقی صورتِ حال یہ ہے کہ جُوں جُوں لوگ اس تجسس لذت کوشی میں ڈوبتے جا رہے ہیں ایک طرف ان کی دیوانگی بڑھتی جا رہی ہے اور دُوسری طرف ضمیر کی گہرائی میں موجود اس خلا کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔

چنانچہ عنقریب انسانیت کو ہوش آئے گا اور وہ یہ محسوس کرے گی کہ اس کھوکھلے پن کا علاج صرف ایمان ہے۔ اللہ پر ایمان، کیونکہ یہی وہ واحد عنصر ہے جس کا بدل کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔

اس ایمان و عقیدے سے مراد رنگ برنگے جبّے پہننا یا تسبیح گھمانا نہیں ہے اور نہ اس کا مطلب انسانی زندگی کے باقی پہلوؤں کو نظرانداز کر کے رُوحانی تجلیات میں مست رہنا ہے، بلکہ یہ عقیدہ انسانیت کے طویل تجربات سے گزرنے کے بعد ایک ایسا عقیدہ ہوگا جو انسان کی عقل اس کے جسم اور رُوح سب پر محیط ہوگا۔

اور ایسا مکمل عقیدہ روئے زمین پر صرف اسلام ہے اس کے علاوہ کوئی نہیں۔

اس صورت میں یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ لوگوں کے نام محمدؐ، احمد اور علیؓ ہوں لیکن انسانیت اپنے طویل تلخ تجربات کے نتیجہ میں اس حقیقت تک رسائی حاصل کرے گی کہ صرف اسلام ہی وہ مطلوبہ دین و عقیدہ ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کو متحد کر سکتا ہے اور زندگی کو مختلف اجزا میں بٹ کر تباہ ہونے سے بچاتا ہے۔

اسلام کی راہ میں آج جو بڑی بڑی رکاوٹیں حائل ہیں جب لوگ دین کی طرف عود

کرنے لگیں گے تو ان رکاوٹوں کے دُور ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں لگے گی۔

اور یہ انسانی تاریخ کا پہلا انقلاب نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسانیت افلاسِ روح کی وجہ سے پیدا شدہ خطرے پر متنبہ ہوتی ہے تو وہ افکار و نظریات جن کی تبدیلی ناممکن نظر آتی ہے بڑی آسانی سے بدل جاتے ہیں اور جب انسان کو اپنی بے راہ روی کی بدنصیبی کا احساس ہو جاتا ہے تو وہ رضاکارانہ طور پر ہر اس تنظیم کو قبول کر لیتا ہے جو دین اور عقیدے کی بنیاد پر اٹھتی ہے اور بے راہ روی ہی آج کے اضطراب کا سبب اصلی ہے۔

ایسی صورت میں لوگ ناپاک لذت کوشی ترک کر کے معقول اور فطری لذت کے ذرائع پر اکتفا کر لیتے ہیں اور اس میں حقیقی لذت و سکون محسوس کرتے ہیں۔ دلکشی اور دلربائی کے وہ تمام طریقے جو آج عورت کی خصوصیت بن گئے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ اپنی ذات اور اپنے وجود کا احساس کر کے لذت حاصل کرتی ہے اور جن میں اس حد تک دھنس جانے کے بعد ان کا چھوڑنا اسے دشوار نظر آتا ہے آج اسی دلکشی اور دلربائی سے خود یورپی اور امریکی عورت انتہائی خائف اور لرزہ براندام ہے۔

یہ درست ہے کہ اس کی وجہ سے عورت کو اپنی ذات اور وجود کا احساس ہوتا ہے لیکن اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اسی کی وجہ سے دوسری عورتوں کی ذات بھی حقیقت بن جاتی ہے اور نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ دوسری عورت اس کے خاوند، منگیتر اور محبوب پر قبضہ کر لیتی ہے جس کی وجہ سے خاندان کا شیرازہ بکھر جاتا ہے، تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں اور دلوں میں کبھی نہ مندمل ہونے والے گھاؤ پڑ جاتے ہیں۔

عنقریب عورت کو اس حقیقت کا علم ہو جائے گا کہ اسے ان مصنوعی چیزوں کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ پسندیدگی کے فطری اور پاکیزہ طریقے اختیار کرے اور فتنہ سامانی کے بدبختی پیدا کرنے والے حربے چھوڑ دے۔

اس وقت لوگ دین و مذہب کی طرف رجوع کرینگے اور وہ دین اسلام ہو گا۔ دین کی قوت انسانی ارادے سے کہیں زیادہ بڑی اور طاقت ور قوت ہے کیونکہ اس کی بنیاد اللہ کی وہ سنّت ہے جو اس نے انسان کی فطرت میں رکھی ہے اور اپنا کام اندر ہی اندر سرانجام دیتی رہتی ہے۔ اور جب یہ وقت آئے گا ـــــ دراصل عقاید کے معاملات میں ایک یا دو نسلوں کا کوئی حساب نہیں ہوتا ہے ـــــ اور یہ بات کچھ زیادہ اہم نہیں ہے کہ کب ایسا ہو گا۔ سب سے اہم بات صرف یہ ہے کہ ایسا ہو کر اور اسلام آ کر رہے گا۔ کیونکہ ابھی اللہ کی مشیّت میں انسانیت کی فنا مقدّر نہیں ہے۔ اس لیے عنقریب یہ وقت آئے گا۔

اور جب وہ دن آئے گا ـــــ جیسا کہ انشاء اللہ آ رہا ہے۔

تو مسلمان نسلوں نے کفر و اسلام کے درمیان حائل گہرے خندق کو پاٹنے اور اس پر پل بنانے کے لیے جو جانوں کی قربانیاں دی ہیں اور اس سلسلے میں جو مصائب و آلام برداشت کیے ہیں۔ کیا کوئی چیز ان کے مساوی اور ہم قیمت ہو سکتی ہے؟

کوئی نہیں! ـــــ کوئی چیز ان کے برابر اور ہم قیمت نہیں ہو سکتی۔

یہ وہ عظیم قربانیاں ہیں کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی دونوں جہانوں میں ان کے اجر و جزا کی ضمانت دے سکتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے یہ ضمانت دی ہے کہ ان کا اجر اس کے پاس محفوظ ہے:

وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ـ الحج (۴۰) جو لوگ اللہ کے دین کی مدد کرتے ہیں اللہ ان کی مدد ضرور فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ طاقت ور اور غالب ہے۔"

صدق اللہ العظیم

مختصر تعارف: قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ)

الحمد للہ رب العالمین ترجمہ قرآن حکیم کو دو رنگوں کے استعمال سے آسان اردو زبان میں اور اس انداز میں ترتیب دینے کا اچھوتا خیال اول قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ) کے بانی صدر مولانا سیّد شبیر احمدؒ کے دل میں پیدا ہوا۔ قرآنی عربی کے جید عالم ہونے کے ناطے اس کام کو عملی شکل دینے کا بیڑا بھی انہوں نے خود اٹھایا۔ اگر ہم 20 سال پیچھے کے اپنے دینی کلچر پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی سوچ دبی دبی بلکہ ناپید تھی۔ اس پس منظر میں ترجمہ قرآن حکیم کے کام کو اس انداز میں پیش کرنا کہ لوگوں کو متوجہ بھی کرے اور تحریک بھی پیدا ہو اور یہ کہ قرآن فہمی کے ایک نئے دور کا آغاز بھی ہو۔ اس کا کریڈٹ خالصتاً قرآن آسان تحریک کے بانی اور دیگر ارکان کو جاتا ہے جنہوں نے اس کام کو ایک انقلابی تحریک کے ذریعہ شروع کیا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ کام ہمیشہ جاری رہے گا۔

قرآن مجید کے اس ترجمے کا آغاز 1988 کے اواخر میں ہوا۔ اس دوران کام کی راہیں متعین کرنے کے لئے متعدد تجربات کیے گئے اور مختلف انداز اختیار کیے گئے جس پر بہت وقت لگا اور شدید محنت کے ساتھ کثیر مصارف بھی ہوئے۔ یہ سارا کام "رضیہ شریف ٹرسٹ" کے تعاون سے ہوتا رہا۔ بعد ازاں تقریباً ایک سال کام معطل رہا پھر جب "قرآن آسان تحریک" کی رجسٹریشن عمل میں آئی تو دسمبر 1991ء سے اس کام کا دوبارہ اجراء قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ) کے پلیٹ فارم سے کیا گیا۔ دسمبر 1993 سے تین جلدوں میں سورۃ فاتحہ تا سورۃ توبہ جلد اول پھر سورۃ یونس تا سورۃ عنکبوت جلد دوئم اور سورۃ روم تا سورۃ الناس جلد سوئم شائع ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں پورا قرآن کریم ایک جلد کامل میں جس کے 1088 صفحات ہیں اور تیس علیحدہ علیحدہ پاروں کی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے جس کے کل صفحات 1104 ہیں۔ ترجمہ پر نظر ثانی کے بعد اب نئے سوفٹ ویئر کے ذریعے نئی فلمیں اور پلیٹیں بنائی گئی ہیں، ٹائٹل اور جلد بندی خصوصیت کی حامل ہیں۔ علاوہ ازیں خوبصورت جہیز ایڈیشن آرٹ پیپر پر شائع کیا گیا ہے۔ اور اب پورا قرآن مجید 5 مختلف سائزوں (جمبو، کامل، حمائل، پاکٹ، ڈائری) میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے انگلش زبان میں بھی اسی انداز کا ترجمہ مرتب ہو رہا ہے انگلش میں پہلے 10 پارے اور پارہ نمبر 30 طبع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ پہلے پانچ پاروں کو ایک جلد میں Vol-1 اور (پارہ نمبر 6 تا 10) Vol-2 میں شائع ہو چکے ہیں اور نماز (Book of Salaat) بھی شائع ہو چکی ہے۔

پارہ نمبر 1 تا 5 اور پارہ نمبر 29 اور پارہ نمبر 30 "اردو مع تلفظ و ترجمہ" شائع ہو گیا ہے۔ اب الحمد للہ پارہ نمبر 6، پارہ نمبر 7 اور پارہ نمبر 28 بھی چھپائی کے آخری مراحل میں ہے۔ اس کاوش کو بہت سراہا گیا ہے۔ اس کے بارے میں قارئین کے بہت سے تعریفی خطوط موصول ہوئے ہیں۔ نیز اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی تو پورے پاکستان میں بالخصوص اور پوری دنیا میں بالعموم اس ترجمہ کو پہنچانا ہمارے مقاصد کا حصہ ہے۔

بنیادی پالیسی

"قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ)" کی بنیادی پالیسی یہ ہے کہ قرآن و سنت کی خالص تعلیمات کو عام کیا جائے اور دی سیاست اور فرقہ بندی سے علیحدہ رہتے ہوئے قرآن کی خدمت کی جائے تحریک اپنی مطبوعات غیر تاجرانہ انداز میں لوگوں کو فراہم کرے اور کسی بھی قسم کا منافع اور افراد کا مالی تعاون صرف "قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ)" کے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا جائے تحریک کے تمام کام اسلام کے معروف طریقہ کے مطابق ہونگے۔

Understand
THE HOLY QURAAN
with
ENGLISH TRANSLATION
and
TRANSLITERATION
with the HELP of 2 COLOURS

WA LA-QAD YAS-SAR-NAL-QUR-AA-NA وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ
And indeed We have made easy this Quraan

LIZ-ZIK-RE FA-HAL MIM-MUD-DA-KIR لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ
for admonition then is there any who would take admonition?
(AL-QAMAR-17)

Quran Asan Tehrik®
A Non Commercial Organization,
Committed to
Spread the Message of Quraan-e-Hakim
in 2 Colours Translation and with Transliteration"

*** Popular among all Schools of Thought**
*** Available in Paras, from 1 to 11 and in**
Vol -1 (1 to 5) Paras at Book Sellers

مختصر اغراض و مقاصد

1۔ قرآن حکیم سے مسلمان کا ٹوٹا ہوا رابطہ جوڑنے کی غرض سے اس مسلے کا یہ مغالطہ دور کرنے کی جدوجہد کرنا کہ قرآن بہت مشکل ہے۔ اس کا سمجھنا صرف علما کا کام ہے اور ایک عام مسلمان کے لئے سمجھے بغیر محض اس کی تلاوت کر کے ثواب حاصل کر لینا کافی ہے۔

2۔ مسلمان کو اس بڑی حقیقت سے باخبر کرنا کہ قرآن اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے نازل فرمایا ہے اور اس مقصد کے لئے اُسی نے اسے آسان کر دیا ہے۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (القمر۔17) اور یقیناً آسان کر دیا ہے ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار (اقبال)

3۔ عربی زبان نہ جاننے کی وجہ سے ایک عام مسلمان قرآن سے براہ راست فہم مطالب پر قدرت نہیں رکھتا اور اردو زبان میں جو ترجمے موجود ہیں ان کو پڑھتے وقت ایک عام پڑھنے والا یہ تعین کرنے سے قاصر رہتا ہے کہ ترجمے میں عربی کے کس لفظ کے معنی کیا ہیں؟ اور جو مفہوم ادا ہوا ہے وہ کن الفاظ کا ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ ان ترجموں کو مسلسل پڑھتے رہنے کے باوجود قرآن کا طالب علم کبھی اس قابل نہیں ہو پاتا کہ وہ براہ راست قرآن کے الفاظ سے مفہوم و معنی سمجھ سکے اور مدت العمر اس کے اور قرآن کے درمیان ترجمہ کا پردہ حائل رہتا ہے، لہٰذا اس ادارہ نے ایک ایسا ترجمہ مرتب کیا ہے جس میں اردو الفاظ کی ترتیب وہی ہے جو قرآن مجید میں عربی الفاظ کی ہے اور متن و ترجمہ الفاظ اور ان کے معانی کے حتمی تعین کے لیے عربی متن اور اردو ترجمہ دونوں کو دو مختلف رنگوں میں اس طرح چھاپا گیا ہے کہ عربی کا لفظ جس رنگ میں ہے اس کا ترجمہ بھی اسی رنگ میں ہے تاکہ پڑھتے وقت بغیر کسی دقت کے یہ معلوم ہو جائے کہ عربی کے کس لفظ کے اردو میں کیا معنی ہیں اور پڑھنے والے میں بتدریج قرآنی عربی جاننے اور قرآن سے براہ راست مفہوم سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

4۔ قومی اور ملکی سطح پر یہ کوشش کرنا کہ قرآن حکیم کا جو نسخہ مسلمانوں تک پہنچے وہ معیاری، باترجمہ اور غلطیوں سے پاک ہو۔

5۔ قرآن حکیم کے پیغام کو تعلیمی اداروں، مساجد اور ویب سائیٹ کے ذریعے عام کرنا۔

6۔ قرآن حکیم کی طباعت و اشاعت اور تقسیم کا وسیع پیمانے پر انتظام کرنا اور اس کو دنیاوی تجارت اور منافع اندوزی کے چکر سے نکال کر خالص نجات اخروی کا ذریعہ بنانا تاکہ ہر مسلمان کے لیے قرآن حکیم کا حصول بغیر کسی مالی بوجھ کے ممکن ہو سکے۔

7۔ قرآن حکیم کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے قرآن حکیم کا ترجمہ دنیا کی معروف زبانوں میں عام فہم انداز میں کرنا اور بڑے پیمانے پر اس کی اشاعت کرنا۔

8۔ ہم خیال افراد اور غیر سیاسی تنظیموں سے جن کے اغراض و مقاصد تحریک کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوں ان کے کاموں میں تعاون کرنا۔

اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہیں تو تحریک کے ساتھ مندرجہ ذیل طریقہ سے تعاون کیجیے

(الف) تحریک کی رکنیت مبلغ پانچ صد روپے سالانہ اور تاحیات ممبر شپ مبلغ دس ہزار روپے ہے۔

(ب) زرِ تعاون حسبِ توفیق۔

(ج) مطبوعات کتب خود خریدیں اور خرید کر تقسیم کریں۔

" قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ) " ایک ایسی انتظامیہ کے ہاتھ میں ہے جو اپنی مطبوعات غیر تاجرانہ انداز سے تقریباً لاگت پر فراہم کرتی ہے۔ یہ نہ صرف شدید دینی ضرورت ہے، بلکہ اس میں کام آنے والا ہر پیسہ اور ہر کوشش ایک صدقہ جاریہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب تک تحریک کے 5000 سے زائد رکن بن چکے ہیں۔ جس میں 375 سے زائد لائف ممبر اور معاونین اس کے علاوہ ہیں۔ مجلس شوریٰ کے اراکین کی تعداد 13 ہے۔ تحریک کے حسابات باقاعدہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے آڈٹ کروائے جاتے ہیں۔ قرآن آسان تحریک (رجسٹرڈ) کی آمدن اور اس کو دیے جانے والے عطیات بھی انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔